

طیاریں نکالیں

ایک بار پھر ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور شاید وہ مہراٹھا کر اپنے سب سے چھوٹے سپوت پر نظر کرم ڈال ہی لیتے اگر باگڑو ایک دم سے ہی آکر ان کے پیروں پہ لوٹنا شروع کر دیتا اور نتیجتاً ان کی توجہ کی ڈوری ایک بار پھر مہراٹھا کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی۔
”اوہ کی گل اے میرے باگڑو۔ میرا شیر۔“ وہ

اسے الی کی بے نیازی بری طرح کھل رہی تھی جو اس کے گھنٹہ بھر سے اس پاس منڈلانے اور من من کر کے کچھ کہنے کی کوشش کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلسل گیندے کے پھول کے لاڈ اٹھانے میں مصروف تھے۔
”الی پلیز۔“ اس نے ”پلیز“ کو لمبا کھینچتے ہوئے



اپنے پلے پلائے موٹے تازے بلے کے لاڈ اٹھانے لگے۔

”اف۔ ف۔“ مہران نے لب بھینچ کر باگڑو کے منحوس تھوڑے کو غصے سے دیکھا جو اس کے الی کے زانو پر دھرا تھا اس کی چنی منی سی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن چہرہ پھرتی ہوئی مونچھوں تلے مہران کو خواہ مخواہ ہی ایک طنزیہ مسکراہٹ بھی نظر آگئی اور تو اور اسے یہ بھی لگنے لگا کہ خبیث باگڑو ضرور پکلوں کی جھڑی سے اس کی بے بسی کا مزہ لوٹ رہا ہے۔

”الی! آپ میری بات بھی سنیں گے یا نہیں؟“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر ڈھیٹ

پن کا مظاہرہ کیا۔

”کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی یا نہیں؟“ بدستور اس سے رخ پھیرے پھیرے ہی خواجہ خلیق الرحمان نے منہ سی جھڑکی دی۔

”الی! میں یہ کہنا چاہا۔“ بات تو شروع کر لی اس نے لیکن الی کی بے توجہی بھانپ کر پھر چپ کر گیا۔ ان کا ایک ہاتھ گود میں ”کاکا“ بن کر لیٹے باگڑو کو تھپک رہا تھا تو دوسرے ہاتھ میں پکڑی جھڑی کی نوک سے وہ کیاری میں نجانے کیا کھود کر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے الی کی اس سلطنت کا رقیبانہ جائزہ لیا جہاں اگر وہ خود کو فراموش کر بیٹھتے

مکمل ناول



www.weakstodie.com

www.weakstodie.com

تھے تو اولاد کیا چیز تھی۔ اس نے مٹھی میں ہال بھینچے ہوئے کینے تو نظروں سے ایک ایک چیز کو گھورا۔
التماس کے پیلے پیلے پتھوں سے لدے تین

درخت۔
لکڑی کے چرچاتے گیٹ کے دائیں طرف والی دیوار کو مکمل ڈھانپے ہوئے مٹی پلانٹ کی سرسبز نیل جسے انہوں نے اپنی خوش بختی کی علامت سمجھ رکھا تھا۔

لیموں کے قد اور پودے کے ساتھ بنایا گڑو کا قلعہ۔
موتے اور رات کی رانی کے پودے جن کی منک کا پوری کالونی میں آگے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے مقابلہ کرنا الی کا محبوب مشغلہ تھا۔

پچھلی طرف والی دیوار کے ساتھ بنی کاریوں میں آگے گلاب گیندے اور سورج مکھی کے پھول۔ ان سے ذرا آگے لان کے عین وسط میں بنے مختصر سے کھیت میں سے جھانکتے گوبھی کے پھول، پتوں میں چھپی جھنڈیاں اور تو ریاں شاخوں سے لٹکتے بدھیت بیٹنگن۔

اس بدزائقہ کھیت کے کچھ نزدیک ہی الی کی کرسی دھری گئی جس پر اس وقت وہ بیٹھے مہران کی قوت برداشت کا امتحان لینے میں مصروف تھے۔ اس نے چڑ کر پھر سے سر گھمایا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اترتی ”بھابھیسر“ پر نظر پڑی تو بالکل ہی ہمت ہار دی۔

”اب کیا خاک بات ہو سکے گی۔“ اس نے چائے اور اس کے لوازمات سے بھری طشتریاں اٹھائے بھائیوں کے ٹولے کو دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

”کہاں چلے بر خوردار؟ تم تو کچھ کہنے والے تھے ناں؟ کوئی اہم بات؟“ الی نے پچھلے آدھے گھنٹے میں اب کہیں جا کر اسے سرائیٹھا کے دیکھا۔

”پھر کبھی۔“ بڑے ہی ضبط کے ساتھ وہ صرف یہ دو الفاظ ادا کر پایا۔

”کمال ہے۔“ حد ہے بدتمیز ہی کی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے مجھے بات نہ کر رکھا ہے۔ بات کرنی ہے،

بات کرنی ہے۔ سب کام چھوڑ چھاڑ میں صاحبزادے کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا ہوں۔ اب قرار ہے میں۔ پھر کبھی۔ بہت خوب۔ سارا موڈ غارت کر کے رکھ دیا۔“

”اور میرے موڈ کی اس وقت کو نیلیں پھوٹ رہی ہیں ناں جیسے۔“ ایک بار پھر اس نے ضبط سے کام لیا اور دل ہی دل میں الی کی مبالغہ آرائی کی داد دیتا ہوا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

”چائے نہیں پوچھے؟“ بڑی بھابھی نے پاس سے گزرتے دیوار کو مخاطب کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا ”لب کھولنے سے وہ هنوز گریز ہی کر رہا تھا۔ مبادا جلے دل کی ساری بھاپ زبان کے رستے باہر نہ نکل جائے۔“

”میٹھی نکلیاں بنائی ہیں اور بیٹنگن کے پکوڑے بھی۔“ بھابھی نمبر دو نے اٹرکیشن پیدا کرنی چاہی، نجانے کیسے وہ بھول گئیں کہ بیٹنگن مہران کی چڑ ہیں اور وہ جو سوئی کی سوندھی سوندھی خوشبو والی کرکری خستہ میٹھی کیوں کا تصور کرتے ہوئے رک گیا تھا، منہ میں تھلکتے بیٹنگن کی کڑواہٹ محسوس کر کے پھر سے پیر پختا آگے بڑھ گیا۔

”جہیں بھابھی نے اپنی جہیں پہنچی شکنوں میں چند ایک اور کا اضافہ کرتے ہوئے اسے تبصرو کرنی لگا ہوں سے گھورا جبکہ سب سے چھوٹی بھابھی نے پیچھے سے بھی آواز لگائی۔“

”کمرے میں چائے بھجوا دیتی ہوں مہو اور ساتھ میں آلو کے پکوڑے بھی۔ بس ابھی ڈالتی ہوں کڑاہی میں۔“

”مہ نانس۔ مت ناز اٹھاؤ اس کے۔“ سر پہ چڑھتا جا رہا ہے۔ ”الی نے دور سے ہی تنبیہ کی۔ اس کے دھم دھم کرتے قدم اور زور سے فرش پہ بچنے لگے۔“

”قس۔ قس۔“ برآمدے کا دروازہ کھولتے ہی ”ڈونالڈ“ پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا اس سے پہلے ہال کمرے میں پہنچ گیا۔ مہران نے غصے سے الی کے ایک اور لاڈلے کی بدتمیزی

نکالیں، مہران کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ جانتا تھا الہی کی نظر کے ساتھ ساتھ کلن بھی کس قدر تیز ہیں۔

”بھو... بھو...“

اس چیلنج بھرے بھونکنے نے اس کے رہے سے اوسان بھی خطا کر دیے مارے بوکھلاہٹ کے اس کے ہاتھوں سے چھری چھوٹ گئی۔ ”کیسا شور مچا رکھا ہے۔ وہ مواکتا اندر تو نہیں گھس آیا؟“ امی حواس باختہ سی کچن میں داخل ہوئیں۔

”تو اور کیا؟ کچن میں دندنا رہا تھا وہ کتا۔ اگر کسی ہانڈی میں منہ مار دیتا تو؟“ الہی نے بڑا سر جڑھا رکھا ہے ان خبیثوں کو۔ اتنی مشکل سے میں نے اس کتے کے بچے کو نکالا ہے۔“

”اوپ ہوں۔ مہران۔ گالی نہیں بکتے۔“ امی نے سرزنش کی تو وہ جھٹلا گیا۔

”جب آپ ہی معاملے کی سنجیدگی نہیں سمجھ پا رہیں۔ الہی سے تو کسی قسم کی سنجیدگی کی امید رکھنا فضول ہے۔“

”میری سنجیدگی تو تمہارے الہی کے مزاج سے وابستہ ہے، صاف بات تو یہ ہے۔“ انہوں نے دامن چھڑایا تو وہ ہنچ سا گیا۔

”یعنی آپ بھی میری کوئی مدد نہیں کریں گی۔“ امی۔ کبھی تو۔ کبھی تو بیوی کے بجائے صرف ماں بن کر سوچیں۔ کیا آپ کے خیال میں میرا یہ مسئلہ غیر اہم ہے اور کیا الہی کا موقف انتہا پسندانہ نہیں ہے؟“ اس نے منت کی تو تسلی میں دال بھگوتے ہوئے شفیقہ خاتون کے ہاتھ کھم گئے۔ نظر اٹھا کے خوبصورت جوان بیٹے کو دیکھا جو سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب سے لاڈلا بھی تھا۔ دل پسج گیا۔

”میں مانتی ہوں، ان کا رویہ بہت سخت ہے۔ کچھ سننے پہ تیار ہی نہیں ہوتے وہ۔ کم از کم میری تو ایک نہیں سنیں گے۔“

”اور وہ “ایک“ آپ کبھی کہہ بھی نہیں سکیں گی۔“ وہ ناراض ناراض سا واپس پلٹنے لگا۔

”ایک طریقہ ہے۔“ امی کی آواز پہ وہ خوش گلن ہو

ملاحظہ کی۔ گردن اٹھما کے لان کی طرف دیکھا جہاں اس وقت الہی اپنی چیمٹی بسوؤں کی تنگت میں نی پاری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ تخریبی اشیاں میں مسکراتا ہوا اس بد شکل بطنے کی طرف برہا جو ٹھک ٹھک چلتا ہوا کچن کا رخ کر رہا تھا۔

”لاپنگی بد نیتا۔“ مہران نے بڑبڑا کر اسے دونے نام دیے۔ پچن سے نکالنے سے پہلے امی اس کی پیٹ پوجا کا انتظام جو کر دیتی ہیں، اس لیے ہر وقت وہاں کھٹے کٹے لیے تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے مہران جانتا تھا امی اس وقت اپنے کمرے میں عصر کی نماز ادا کر رہی ہوں گی اور بھائی تو اب رے کے رے صاف کر کے ہی اندر آئیں گی۔

”اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں اس بے سرے ڈونالڈ سے نجات حاصل کرنے کا۔“

آج کل اس کے ذہن میں ہمہ وقت ایسے ہی باغیانہ اور تخریبی منصوبے گلبلا تے رہتے تھے۔ جس وقت وہ الہی کے سامنے کھڑا ان کی چند لکھوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تب بھی اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ کتنے سے ان بڑے بڑے پھولوں کی ایک ایک پتی توجہ لے۔

بسی بسی مرل سی بھندریوں کا پتہ مر نکال دے۔
توریوں کو مروڑ کر رکھ دے۔

اور کچھ نہیں تو کم از کم اس ڈیل باگرو کی دم ہی پیروں تلے اس بری طرح چل کر رکھ دے کہ وہ دن تک بلبلاتا پھرے۔

ہائے۔ لیکن۔ الہی کی نظر اب نہیں پڑتی تھی تو صرف اس پہ ہی نہیں پڑتی تھی ورنہ اپنی اس راجدھانی کی چوکسی وہ خوب کیا کرتے۔ ”اس“ بھدے بے سرے قوال کی چونچ نہیں بند ہو سکتی ورنہ بغیر فوج کیے ہی راحت کی طرف لے جاتا، وہ خود ہی طال کرتا اور پھر خود ہی روٹھ کرتا۔ ”بڑبڑاتے ہوئے اس نے ایک تیز و ہار چھری لہرائی اور ڈونالڈ کو گردن سے دیوچ لیا۔

”قیں... قی قی۔“ اس نے دردناک آوازیں

کر پھر رک گیا۔
”اگر سب لوگ مل کر انہیں سمجھائیں، انہیں
منانے کی کوشش کریں تو ہو سکتا ہے بات بن
جائے۔“

”سب لوگ کون؟ یہ سب؟ یعنی بھائی بھائی
فیملز۔ تو بے کیجیے۔ یہی تو ابی کی مشیرنیاں ہیں
اور یہ بھلا کہاں میرا ساتھ دیں گی۔ میرا گھر بسانا تو بڑی
بات ہے، اس کا ذکر سننے ہی چاروں کے زخم ہرے ہو
جاتے ہیں۔ کورس میں بھل بھل رونا شروع ہو جاتی
ہیں۔“

”وہ تو بس۔۔۔“ امی نے سر جھٹکا۔ ”وہ الگ بات
ہے لیکن مجھے یقین ہے میں ان سے پیار سے بات
کروں گی تو وہ ضرور سمجھ جائیں گی۔“

”وہ شاید سمجھ تو جائیں لیکن یہ بات بھول جائے کہ
میرے سلسلے میں وہ ابی سے بات کرنے پر تیار ہوں
گی۔ وہ کب چاہتی ہیں کہ۔۔۔ آپ لکھ لکھ لکھ
میری بات۔ یہی چاروں ہیں ابی کے دلغ میں آئے
سدھے خیال بھرنے والی۔ آپ بس اندر بیٹھے
بیٹھی نمازوں کے بعد لے لے دیکھنے بڑھا لیتے اور وہ
بینگنوں کے پکوڑے بنا بنا کے انہیں کھلاتی رہیں اور
ان کے مزاج اور بگاڑتی رہیں۔“

”بری بات مینا! میرے چند ایسے نہیں کہتے اپنے
بہنوں کے بارے میں اور نہ سوچتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ مان لیا سب مجھ سے بڑے ہیں۔

میں سب سے چھوٹا سہی مگر اب اتنا بھی چھوٹا نہیں اور
نہ ہی تمام عمر چھوٹا رہوں گا۔ جو ان تو ہو چکا ہوں، ایک
دن بوڑھا بھی ہو جاؤں گا لیکن ہوتا رہوں، آپ کو کیا
ابی کو کیا؟ وہ کچن سے باہر جا چکا تھا لیکن شفیقہ خاتون
اسی طرح بے بسی کے عالم میں گھڑی اس کی باتیں دہرا
رہی تھیں جو حرف بہ حرف سچی تھیں لیکن خواجہ
خلیق الرحمان۔ وہ جس بات پہ اڑ جا میں پھر اس
سے ایک انچ سر کنا بھی مشکل تھا۔



خواجہ خلیق الرحمان بس ایسے ہی تھے یہ بات

نہیں کہ ان کا دل بہت سخت تھا یا اولاد کے لیے وہ بہت
کڑھم کے باپ ثابت ہوئے تھے۔ دل تو ان کا بہت
گداز تھا اور اس میں پیار بھی بے حد بے حساب بھرا
ہوا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھوں لگائے پھولوں پودوں کے
لیے اتنے حساس ہو سکتے تھے تو اپنی پیدائش کی اولاد کے
لیے کیوں نہیں۔ اپنے پالتو جانوروں کے لیے اتنے ذمہ
دار ثابت ہو سکتے تھے تو اولاد کے سلسلے میں لاپرواہی کیسے
پر تھیں گے لیکن۔۔۔ ایک بات ایسی تھی جس کے
آگے وہ بے بس تھے۔ بس یہاں اگر ان کا دل سخت ہو
جاتا تھا۔ برسوں پہلے وہ جو خواب دیکھ چکے تھے، اس کی
تعبیر کھلی آنکھوں دیکھنے کی خواہش وقت کے ساتھ
ساتھ اور پختہ ہوتی چلی گئی۔ ابی کی خواہش پہلے
پہل اسے بھی اوروں کی طرح انوکھی مگر بے ضرری
لگتی تھی لیکن اب حالات کیا سے کیا ہو جانے کے
باوجود بھی ان کا اسی طرح ضد پہ ڈٹے رہنا اسے سراسر
نا انصافی اور ہٹ دھرمی لگنے لگا۔

خواجہ خلیق الرحمان کے جب اوپر تلے مانچ بیٹے
ہوئے تو سب کو ان کی خوش بختی کا یقین ہو گیا لیکن ان
کے دل میں جو پہلے بیٹے کے بعد سے ہی ایک باری
ہی، من موہنی سی، منی سی گڑیا بیٹی کی تمنا جاگ اٹھی
تھی وہ مرجھا سی گئی۔ سن تو یہی رکھا تھا کہ بیٹی ہی والدین
کا سہارا ہوتی ہے۔ غم خوار و مونس ہوتی ہے۔ پرانی ہو
کر بھی اپنی رہتی ہے جبکہ بیٹے اپنے ہو کر بھی پرانے
ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنا دکھ بے جی سے بانٹنا چاہا تو وہ منس
پڑیں۔

”جھلیا! تو سدا جھلا ہی رہے گا۔ باتیں بس باتیں ہی
ہوتی ہیں۔ کوئی تقدیر کا لکھا حکم تو نہیں۔ تو کیوں فکر
کرنا ہے۔ چند سالوں کی بات ہے تیرے ویڑے بھی
ایک کے بعد ایک دوہتی اترے گی تو سارے دھیوں
والے چاؤ کر لے گا انشا اللہ۔“ بے جی کی تسلی بھی ان
کی ہمت نہ بڑھا سکی۔

”لیکن بے جی! کیا پتا آگے قسمت میں کیا لکھا
ہے۔ آنے والیاں کیا تحفے لے کے آتی ہیں۔ تمہیں
بیٹے بھی نہ چھین کے لے جائیں۔ بالکل خالی ہاتھ ہی

رہ جاؤں۔ لڑکے تو پھر اپنی بیویوں کے کہنے پر چلتے ہیں
ناں۔

”تو تو نہیں چلا اپنی زنانی کے کہنے پر۔“ بے جی نے
چھیڑا۔ ”بے چاری کی جان قبض کیے رکھتا ہے، ساہ
(سانس) سکھائے رکھتا ہے اس کا۔“

”نہیں بے جی۔“ وہ شرمندہ سے سر جھٹکنے
لگے۔ ”میں نے کیا سانس سکھاتا ہے۔ وہ تو۔ بس
ہے ہی ایسی۔ اور پھر وہ مجھے کچھ کہے گی تو میرے کچھ
کرنے کی نوبت آئے گی۔“

”اس کا مطلب ہے وہ تجھے اپنی سیدھی بیٹیاں نہیں
پرہاتی تو پھر ثابت کی ہو کہ سو میں بھی اچھی ہوتی
ہیں۔ ضروری نہیں ساری کی ساری ڈانسیں ہی
ہوں۔“

”اوہو بے جی۔ شفیقہ کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے
یہاں۔ میں آپ کا اکیلا اکیلا بیٹا۔ لہاجی اس کے گھر
آنے سے پہلے اللہ کو پارے ہو گئے۔ نہ دیور جیٹھ کا
رولا (شور) نہ دیورالی جیٹھانی کا جلاپا، بس اس کا بڑا ہی
راج ہے۔ ایک آپ ہی آپ ہیں جو بیٹھے پہ بیٹھے
بیٹھے اسے دعا میں دیتی رہتی ہیں۔ آپ سے اسے کیا
شکایت۔ اس لیے گھراتا سکون سے چل رہا ہے لیکن
میرے خیر سے پانچ بیٹے سب کی اپنی اپنی بیویاں۔
الگ الگ گھروں کی، الگ الگ مزاج والی، الگ الگ
عادتوں والی، اپنی اپنی فطرت اور خصلت لے کر آئیں
گی۔ بھلا کتنے دن گزارا کر سکیں گی اکٹھے ایک ہی
چھت تپ ایک کو دوسری کی عادتیں بری لگیں گی،
دوسری کو تیسری کے رہن سہن پہ اعتراض ہو گا،
تیسری کا چوتھی سے نباہ کرنا مشکل ہو گا تو چوتھی کو
پانچویں کا وجود کھٹکے گا۔ ان کی کھینچا تانی میں۔ بے جی
میرے بچے۔ میرے بیٹے بکھر جائیں گے۔ میرا
آشیانہ تنکا تنکا ہو جائے گا۔ کیا فائدہ میرے برسوں
محنت کر کے انہیں پالنے پوسنے کا۔ مجھے اتنی جان مار
کر کیا ملے گا۔“

”اچھا چل چھوڑ ساری فکریں، بڑا آسانا کہیں کا۔
بڑا پتر تیرا پانچویں چڑھا ہے اور چھوٹا ابھی گودی ہے اور

بیوٹی بکس کا تیسرا کردار

سوہنی بیسرائل



* گرتے ہوئے بالوں
کو روکتا ہے۔
* نئے بال اگاتا ہے
* بالوں کو مضبوط اور
چمکدار بناتا ہے
* مردوں کو عورتوں اور
بچوں کے لیے یکساں مفید
* ہر موسم میں استعمال کیا
جاسکتا ہے

”سوہنی بیسرائل“ قیمت / 60 روپے
12 جڑی بوٹیوں کا مرکب

ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا
یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر
میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں دینی خریدنا جانتے ایک شخص
کی قیمت صرف 60 روپے ہے دوسرے شہر والے مٹی آرڈر
بھی کر کے جڑی بوٹیوں سے منگوائیں دوسرے منگوانے والے
مٹی آرڈر اس حساب سے سمجھائیں۔

ایک شیشی کے لیے 80 روپے

2 شیشیوں کے لیے 140 روپے

3 شیشیوں کے لیے 210 روپے

نوٹ: میرے ہاں ایک ایک پیکیٹ چار جڑی بوٹیوں ہیں
سہلے آرڈر بھیجنے کے لیے ہمارا پتہ

بیوٹی بکس 53 اور گریب مارکیٹ سیکنڈ فلوئر ایم اے جناح روڈ کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیسرائل ان بوتلوں سے حاصل کریں
و بیوٹی بکس 53 اور گریب مارکیٹ سیکنڈ فلوئر
ایم اے جناح روڈ کراچی

مکتبہ عمران ڈائجٹ 37 اردو بازار
کراچی فون نمبر 7733021

تو ان کی زبانوں کے جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا تو خلق کا کہ۔“ تین تین ضائع جاتے دیکھ کے بے جی کی فطرت پھر عود کر آئی اور وہ ڈانٹ ٹیٹ کے بیٹے کے سر پہ سے یہ فضول بوجھ اتارنے لگیں۔

”اور اگر اتنی ہی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں تو پھر میرا مشورہ مان۔ لڑکوں کے جوان ہوتے ہی ان کی شادی کسی ایسے گھر کر دینا جہاں پانچ بہنیں ہوں۔ سب کی بیویاں سنگی بہنیں ہوں گی تو تیرا اور بھی جاتا رہے گا کہ دیورانی جتنی کا جھگڑا گھر توڑ دے گا۔ ایک گھر کی پلی بڑھی بچیوں میں تو نباہ ہو جائے گا۔“

بے جی کے اس مشورے پہ خواجہ خلیق الرحمان نے استہزاء سے ہنکارا بھرا اور چپ رہے۔ برصہا پے میں تنہا رہ جانے کا خوف ابھی سے ان کی نیندیں اڑائے ہوئے تھا اور یہ تب کی بات ہے جب ان کا سب سے بڑا بیٹا خواجہ فرقان خلیق میٹرک کے امتحان میں پاس ہوا تھا۔ وہ پورے محلے اور ساری برادری میں لٹو بانٹتے نہ تھک رہے تھے۔ لٹوؤں کا نوکرا لے کر وہ بڑی خوشی خوشی اپنے ماؤ جی کے ہاں گئے تھے۔ گھریار اور کاروبار کی الجھنوں میں بڑے کئی کئی مہینے وہاں جانا نہیں ہو پاتا تھا ورنہ وہ اپنے ماؤ جی سے بڑی محبت اور انسیت رکھتے تھے۔ اپا جی کے گزرنے کے بعد انہی میں والد کی شبیہ و ہونڈتے تھے۔ شفیقہ نے یہ بڑا سا نوکرا دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”یہ کیا جی؟ سارے گھروں میں تو ڈبے اور تاؤ جی کے گھر پورا نوکرا۔“

”تو تاؤ جی کا ٹبر (کنبرا) بھی تو بڑا ہے ناں۔ بڑے بھائی صاحب تو خیر سے پوتے والے بھی ہو گئے۔ باقی سب بھی اپنے اپنے بیوی بچوں والے۔ بہنیں بھی اپنے اپنے گھر والی۔ تاؤ جی ان کے گھر بھی تو چار چار لٹو پکڑائیں گے آخر پھوپھیاں ہیں وہ میرے فرقان کی۔“

”ہاں یہ تو ہے ماشا اللہ جی بھی تو زیادہ ہیں تاؤ جی کے گھر۔ واقعی یہ نوکرا ہی پورا آئے گا۔“ شفیقہ سر ہلا کے

چپ ہو رہیں لیکن واپسی پہ جب خواجہ صاحب کا بچھا بچھا چہرہ پہلی پینک رنگت اور گرم صم کیفیت دیکھی تو چونک گئیں۔

”کیا بتاؤں شفیقہ! مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا یہ سب کیسے ہوا۔ کس نے تاؤ جی کے ہتے بستے گھرائے کو نظر لگا دی۔ لیکن۔۔۔ کسی کے نظر لگانے سے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا برسوں میں بنائے گئے گھرائے کچے ہوتے ہیں کہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ جائیں برباد ہو جائیں۔“

”ہائے ہائے خیر کی بات کریں خواجہ جی! اللہ خیر رکھے ہر طرف۔“ وہ ہول انھیں۔

”اب کیا خیر ہونی ہے شفیقہ! جا کر دیکھو ذرا تاؤ جی کا گھر۔ کیسی چمک پھل ہوتی تھی سارے میں۔ یہ لبھا دسترخوان بچھتا تھا۔ سارے مل کر کھانا کھاتے تھے۔ ہتے بولتے تھے۔ اب۔ اب تو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ وہی گھر ہے وہی چھت، بس فرق یہ پڑا ہے کہ چند دیواروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تینوں بھائی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اپنا حصہ انہوں نے علیحدہ کر لیا ہے۔ کاروبار میں بھی اور مکان میں بھی۔ جب سے انہوں نے چھوٹے دونوں لڑکوں کی شادی کی ہے۔ خاندان میں یہی تہ کرہ ہو رہا تھا۔ میں سن کر بھی یقین نہیں کیا۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سراج اوپر چلا گیا ہے بیوی بچے لے کر، معراج اور وہاں دونوں نے بچے کے حصے کو دو حصوں میں بانٹ لیا ہے دیوار کھڑی کر کے۔ اور تو اور جانتی ہو سراج بھائی صاحب نے اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی گھر کے باہر سے رکھوائی ہیں۔“

ان کے جھگڑے میں نقصان کس کا ہوا، تاؤ جی کا اور ان کے بیٹوں کا۔ خون کے رشتے کو یہ جلا یا لے ڈوبا۔ مجھ سے تاؤ جی کا حال دیکھا نہیں جاتا۔“ ان کی آواز بن آئی تو شفیقہ کے آنسو بھی چھلک پڑے۔

”یقینوں نے ان کی ذمہ داری بھی بانٹ لی ہے۔ ایک ایک مسینہ تینوں کے پاس رہیں گے اور تمہیں تو پتا ہے کہ کئی سالوں سے وہ کمر کی تکلیف کی وجہ سے

کل کل ہی ختم۔ شفیقہ خاتون کے تو ہاتھ پر پھول
گئے، اگرچہ ابھی فرقان سولہویں سال میں تھا اور کئی
سالوں تک اس کی شادی کا امکان نہ تھا لیکن وہ جانتی
تھیں خواجہ صاحب کسی بات پہ اڑ جائیں تو پھر انہیں
باز رکھنے کی ہر کوشش بے سود ہوتی ہے۔ اس لیے
فوراً انہیں ٹھنڈا کرنے لگ گئیں۔ ان سے زیادہ کون
جانتا تھا کہ یہ دعوے محض غصے میں آکر کئے گئے چند
الفاظ نہیں بلکہ پتھر پر لکیر ثابت ہو سکتے ہیں اگر ان کا
فوری سدباب نہ کیا گیا تو۔۔۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں خواجہ صاحب! ایوں انہی
جگ ہنسالی کرانا چاہتے ہیں۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہو نا
ہے۔ خدا کی رحمت سے کیوں نا امید ہوتے ہیں جی؟ ہو
سکتا ہے آپ کے یہ تمام خدشے بے بنیاد ثابت
ہوں۔ ہو سکتا ہے، آنے والیاں اور بھی زیادہ برکت
لے کر آئیں آپ کے گھر۔ ہو سکتا ہے ان کے
آنے سے ہمارے بچے اور بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ
جائیں اور ہو سکتا ہے۔“

”بس کرو خدا کا واسطہ ہے۔ چپ ہو جاؤ۔ تمہاری
اس ”ہو سکتا ہے“ کے پیچھے میں یہ گھرواؤ یہ نہیں لگا
سکتا۔ چلو مان لیا ”ہو سکتا ہے“ کہ کوئی ایک آدھ ہو
اچھی بھی نکل آئے لیکن بیگم! ایک مچھلی سارے
تالاب کو گندا کرتی ہے۔ کوئی ایک بھی تاؤ جی کی چھوٹی
ہو سو جیسی نکل آئی تو پرنچے اڑ جائیں گے۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں
کے گھر پسانے کا ارادہ ہی ترک کر دیں۔ اچھا ہی ہے کہ
ہم دیکھ بھال کے خود ان کی دانتیں لے آئیں بجائے
اس کے کہ وہ باغی ہو کر خود کوئی قدم اٹھالیں۔“

”نا انگس نہ توڑ کے رکھ دوں نامرادوں کی۔ ایسی کی
تمہی ان کے قدموں کی۔“ وہ تھلما کے بولے۔

”اوہو خواجہ جی! آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ وہ جیتے
جاگتے انسان ہیں۔ کوئی پیڑ پودے نہیں جو قد آور اور
سایہ دار ہونے کے بعد بھی آپ کے پانی لگانے کے
محتاج رہیں گے۔“

”چلو سمجھیں بھی کچھ نہیں سوچھا تو بے جی کی طرح

سیر چھیاں نہیں چڑھ پاتے نہ ہی اتر سکتے ہیں۔ جب
ہوادارہ ہوا تو اصول کے مطابق پہلا حصہ بڑے بھائی کو ملا
یعنی دوسرے سامان کے ساتھ ساتھ تاؤ جی کو بھی مزدور
اٹھا کر اوپر لے گئے اور تاؤ جی بتا رہے تھے کہ پرسوں
جیسے ہی میں دن پورے ہوئے، سراج بھائی صاحب
انہیں اٹھا کر نیچے مچھن میں بٹھا گئے، کپڑوں کا تھیلہ پاس
رکھا اور کال تیل دیا کہ اور چڑھ گئے۔“

”ہائے اللہ۔“ رقیق القلب شفیقہ کی پچکیاں بندھ
گئیں۔ ”اندھیر ہے۔ میری توبہ۔ غضب پڑے گا
ان پہ خدا کا۔ ذرا خوف نہیں ان کے دلوں میں۔“
روتے روٹے ان کی نظر سفید پڑتے خواجہ صاحب پہ
گئی تو روٹاؤ ہونا بھول کر انہیں سنبھالنے لگیں۔

”کیا ہوا جی آپ کو؟ حوصلہ کریں خواجہ جی۔ یہ
پانی بہت ہے۔“ چند گھونٹ پانی کے بھرنے کے بعد ان
میں ذرا ہمت آئی تو نوٹے نوٹے لہجے میں بولے۔
”شفیقہ! ہمارا بھی یہی ہو گا۔ یہی حال ہو گا۔ دیکھ
لیتا۔“

”اللہ نہ کرے جی۔ ہمارے بیٹے تو ماشا اللہ۔“ وہ
تسلی دینا چاہتی تھیں لیکن خواجہ صاحب نے بات
کاٹ دی۔

”ہمارے بیٹے تو ماشا اللہ پانچ ہیں۔ تاؤ جی کے
تین بیٹے اکٹھے نہ رہ سکے تو ہمارے پانچوں کیسے رہ لیں
گے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں تاؤ جی کا اتنا بڑا مکان تھا۔
آسمانی سے تین حصے ہو گئے۔ میرا مکان تو بس اتنا سہاوی
ہے پانچ حصے تو ہر گز نہ ہو سکیں گے۔ اس کا مطلب
ہے میرے بیٹے ایک چھت تلے بھی نہ رہا میں گے۔
ہم مینوں ان کی شکلیں دیکھتے سے بھی ترسا کریں
گے۔ ہماری بھی باریاں لگا کریں گی، ایک مہینہ فرقان
کے گھر، ایک مہینہ نعمان کی طرف پھر وہاں سے عمران
کے ہاں۔ ہائے شفیقہ! ہمارے ساتھ بہت برا ہونے
والا ہے۔ بہت برا ہے۔“ وہ روہانے ہو گئے پھر جیسے
کسی خیال کے تحت فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

”نہیں میں اپنا بڑھاپا دور نہیں روٹنے دوں گا ان
لڑکوں کو۔ میں ان کی شادیاں ہی نہیں کروں گا۔ ساری

کہنے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔ وہ برا سامنہ بنا کر کہنے لگے۔

”جانتا ہوں، میاں! جانتا ہوں اچھی طرح، جو تم نے برسوں سے زمانے بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے۔ تمہاری یہ بات ذہن میں تھی جب ہی تو اس گھرانے اور اس کی بچیوں کو دیکھتے ہی مجھے تمہارا خیال آیا۔ ان لوگوں کو اچھی طرح جانچ رکھ لینے کے بعد ہی میں تم سے بات کرنے آیا ہوں ورنہ ایسے گھرانوں کی کوئی کمی تو نہیں جہاں پانچ چھوڑ آٹھ آٹھ لڑکیاں ہوتی ہیں لیکن شادی بیاہ میں اور بھی سو معاملے ہوتے ہیں، سارا حساب کتاب، حسب نسب، شرافت، مہر، دیکھنے پڑتے ہیں۔ میں ہر طرح سے مطمئن ہو کر ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”یہ تو آپ کی محبت اور عنایت ہے چچا جان! آج کل کون کسی کے لیے اتنی بھاگ دوڑ اور تردد کرتا ہے لیکن آپ نے وقت سے بہت پہلے ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔“

”وقت سے پہلے؟“ چچا حیرت سے بولے۔ ”ارے میاں! فرقان چچیس کا ہونے کو آیا ہے، بڑی مناسب عمر ہے بیاہ کی اور پھر وہ نہ صرف تعلیم مکمل کر چکا ہے بلکہ اب تو تمہارے ساتھ کام میں بھی ہاتھ بٹا رہا ہے۔ بیٹے اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں تو انہیں گھریار کا کروڑنا چاہیے ورنہ قدم غلط راہوں کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔“

”آپ کی بات درست چچا جان لیکن۔۔۔“ وہ متردد ہوئے۔ ”لیکن فرقان اور نعمان ہی شادی کے قابل ہوئے ہیں۔ عمران، جبران کی تو کل لڑکی کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اور مہران تو خیر ابھی بہت ہی کم سن ہے۔“

”خدا تمہیں عقل دے خلیق۔۔۔ جوان بچوں کے باپ ہو اور ہر بات تفصیل سے سمجھائی پڑتی ہے۔“ چچا نے بھیجے کی عقل پہ ماتم کرتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

”پانچوں بیٹوں کا رشتہ ایک ہی گھر میں کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسٹھے ہی سب کے سروں پہ سہرا باندھو۔ ارے جاؤ تو سہی ایک بار بچیاں دیکھو، گھریار

بیٹوں اور درختوں کی مثالیں دینے لگیں۔ ”انہیں چند سال پہلے مرحومہ بے جی کے ساتھ اسی مسئلے پر کی گئی بحث یاد آئی اور ساتھ ہی اچانک وہ مشورہ جسے انہوں نے سرسری سامن کر سر جھٹک دیا تھا۔ ان کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

”چلو ٹھک ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار میں اپنے کے جسے کسی فیصلے سے دستبرداری اختیار کر رہا ہوں۔ تمہاری بات مان لیتے ہیں۔“

”جج؟ واقعی خواجہ جی؟“ شفیقہ کو اتنی جلد ان کے مان جانے کی امید نہ تھی۔ ”ہاں۔ لیکن میری ایک شرط ہے اور میں پہلے ہی واضح کر دوں اب مجھ سے بحث کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کی شادیاں ہوں گی مگر ایک ہی گھر میں۔“ انہوں نے سختی سے کہا۔

”ہیں جی؟“ وہ اس نئے فتوے پر حیران پریشان تھیں۔

”ہاں! ان پانچوں کی بیویاں سنگی بنتیں ہوں گی۔ ورنہ میری طرف سے بھلے ساری عمر کنوارے پھرے۔“ انہوں نے نہ صرف فیصلہ صادر کر دیا بلکہ ہر ملنے جلنے والے کے ذریعے زمانے بھر میں نشر بھی کرا دیا۔ لوگوں کے لیے یہ بات نئی بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ ہر چند کہ ابھی کوئی بیٹا شادی کے لائق نہ ہوا تھا لیکن قریبی رشتے دار یعنی لڑکوں کی خالائیں، ممانیاں، چچیاں وغیرہ اور گرد نظر رکھنے لگیں کہ کہیں کوئی پانچ بہنوں والا مناسب گھرانہ ملے تو شفیقہ خاتون سے ذکر کیا جائے۔ یہ تلاش جاری رہی تاوقتیکہ خواجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے فرقان بی۔ اے کرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ شریک کاروبار ہو گئے۔ ایسے میں ایک دن خواجہ خلیق کے چھوٹے چچا ان سے ملنے آئے اور چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فرقان کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔

”ایک منٹ۔ ایک منٹ چچا! آپ شاید بھول رہے ہیں، میں نے اپنے بیٹوں کی شادی کے سلسلے میں کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔“ انہوں نے پچاس فیصد کو مزید کچھ

سعادت مندی نوٹ نہیں کی؟ کیا تعلیم کے لحاظ سے بھی بڑی دونوں فرقان اور لقمان کے لیے مناسب نہیں ہیں؟ باقی تینوں بھی ابھی چھوٹی سہی لیکن کتنی بالوب اور سبھی ہوئی بچیاں ہیں؟ بولو؟ وہ تاسید میں سر ہلا کے رہ گئیں۔

”تو بس بیگم، بسم اللہ کر کے ہاں کہہ دیتے ہیں۔“ وہ رشتہ کرنے پہ تلے بیٹھے تھے اور وہی ہوا جو وہ چاہتے تھے۔ فرقان اور لقمان کی شادیاں چند ماہ کے اندر اندر مہ لقا اور مہ پارہ سے ہو گئیں۔ وسمہ کی تقریب میں عمران اور جبران کی مہ ناز اور مہ جہیں سے نسبت کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا گیا۔

خواجہ صاحب تو عمران اور ماہ نور کی معافی کا اعلان بھی کرنا چاہتے تھے لیکن شیخ صاحب نے اپنی بیٹی اور خود عمران کی کم عمری کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اہتمام مناسب نہ جانا اور فی الوقت اس سلسلے کو ٹال دیا۔

تقریباً بیس سال بعد ان دونوں کی باری آئی تو عمران ایم بی اے کر رہا تھا اور ماہ نور نے ابھی ایف ایس سی کا ایگزیم دیا تھا۔ وہی روایت بھائی گئی پھر سے ویسے کی تقریب میں شفیقہ خاتون نے گلابی پشواز میں بیروہوئی بنی نازک سی نور کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے نام کی انگوٹھی پر سدا دی۔ عمران کو بھی والدین کا یہ انتخاب پسند آیا۔

نور میں اپنی تمام بہنوں کی مشابہت تھی۔ بڑی باجی جیسا سرو قد، بجیا جیسے لمبے گھنے بال۔ ایسا جیسا گورا رنگ۔ اور آبی جیسی ٹیٹھی طبیعت۔ ان تمام خصوصیات نے اسے سب میں ممتاز بنا دیا تھا۔ خاندان میں بھی یہی چرچا تھا کہ پانچوں بھائیوں میں عمران کا جوڑ ہی ٹھیک بیٹا ہے۔ یہ چہ میگوئیاں سن کر بے چارے فرقان کے دل پہ بڑی بری گزرتی۔ وہ مہ لقا کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا جو ابی جان کی خواہش پوری کرنے کے چکر میں اس کے سر تھوپتی گئی تھی یوں تو وہ فرقان سے سال ڈیڑھ ہی بڑی تھی لیکن شادی کے موقع پہ بھی کم از کم پانچ سال بڑی معلوم ہو رہی تھی اور

دیکھو۔ پسند آئے تو دو بیٹوں کی شادی ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ باقی بچیاں بھی مانگ لو۔ اگر عمران کے جوان ہونے کا انتظار کیا تو فرقان کو بابا بتا دو گے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کمال ہے بچیاں! اتنی سی بات میں سمجھ نہیں پایا۔“ وہ ایک دم سے ہلکے پھلکے ہو کر چچا رشتہ کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنانے لگے۔ آنا ”فانا“ تمام معاملات منٹ گئے۔ خواجہ خلیق اور شفیقہ خاتون دونوں کو شیخ نواز حسین کا گھر نہ بے حد پسند آیا۔ شریف النفس، حلیم الطبع، درمیانی حیثیت کے نمازی پرہیزگار انسان تھے۔ محدود سی آمدنی میں چھ چھ بچیاں پال رہے تھے۔ جی ہاں چھ۔ چھٹی صاحبزادی چونکہ نہایت کم عمر تھیں اس لیے چچا جان نے ان کا ذکر کرنا ضروری نہ جانا تھا، بہر حال جہاں خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کو حسب پسند اور حسب خشا گھر نہ مل جانے کی تسلی ہوئی وہاں دونوں نے خدا کے حضور شکرانہ بھی ادا کیا کہ وہ انہیں ایک مجبور اور شریف کا بوجھ بانٹنے کی نیکی حاصل کرنے کی سعادت بخش دیا ہے۔ شفیقہ خاتون کو بس ایک بات کھٹک رہی تھی اور وہ تھکی سب سے بڑی بیٹی مہ لقا کی غیر اور شکل و صورت۔ وہ تمام بہنوں سے ذرا کم رو تھی۔ عمر بھی فرقان کے مقابلے میں زیادہ تھی اور یہ بات اس کے بالوں میں چمکتے تاروں اور آنکھوں کے نیچے پڑی جھریوں سے صاف واضح ہوتی تھی۔ رنگ بھی دیتا ہوا تھا، نین نقش اچھے تھے مگر بروحتی عمر کے اثرات نے ان کی دلکشی کم کر دی تھی۔ اس بات کا ذکر شوہر سے کیا تو لکھ بھر سوچنے کے بعد انہوں نے لٹی میں سر ہلا دیا۔

”کتنی تم ٹھیک ہو لیکن اس ایک بات کے پیچھے میں باقی سب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چلو میں خود کچھ تمہیں کہتا۔ تم فیصلہ کرو، بتاؤ مجھے کیا تمہیں شیخ صاحب کی شرافت کے بارے میں کوئی شبہ ہے؟ کیا تمہارے خیال میں آج کے دور میں چھ بیٹیوں کا بوجھ انہیں عزت سے پہانے کی ذمہ داری ایک متوسط طبقے کے شخص کی کمر نہیں جھکا دیتی، اس کی راتوں کی نیند نہیں اڑا دیتی؟ کیا تم نے ان سب بچیوں کا سلیقہ، سکھ دیا،

اب شاہی کے چند سال گزرنے اور تین بچوں کے ہو جانے کے بعد وہ تیس زیادہ بڑی اور عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی۔

ایک تو اس کا قد شوہر کے مقابلے میں چند انچ اونچا تھا۔ اوپر سے چوڑے چوڑے مردانہ شانے اور کھڑے سے پہنچنے والے ہاتھ یہ نقش مناسب ہی تھے۔ چہرہ خوب صورت یعنی توہین اور جھکے اچھی سی لگتی لیکن اسے اتنی قدرتی سماں تھی۔ میکا میں بھی بڑی بڑی ہوس کے لہجہ میں خود یہ غیر ضروری رعب و دبدب طاری کر رہا تھا اور مسکرائے اس نے بعد ازاں سے اپنی ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ اس میں مزید کلف آیا۔ الجھ اور لڑنے والے اور تیز مزید حاملان ہو گئے۔ کوئی اور اور ان کے ہاتھوں میں چند دن میں بڑی حیثیتی کی نظرانی بدلتی رہتی تھی یہ وہ سب کچھ تھے جن میں وہ تینوں بچپن سے جانی تھے۔ بڑی بات کی انہیں ٹوپی کی۔ اس لیے معصوم ہونے کے نالی جاتیں۔ البتہ خواجہ صاحب اپنی بڑی ہوس کے لہجہ و لہجہ سے بڑے مطمئن تھے اور اس کا اظہار بھی برعکس کرتے کہ گھر کو منیجائے رکھنے اور اس عمدہ طریقے سے چلائے رکھنے میں وہ لقا کاسب سے زیادہ بات ہے۔

ایک لحاظ سے یہ سچ تھا۔ سچا بہت سی باتیں تھیں۔ سب سے پہلے یہ کہ ان کے خاندان سے حسد لیا جاتا۔ کوئی کم و زیادتی تو ان کے دو بھائیوں کی سہولیات سب کے لیے یکساں تھیں۔ ان کے دو بھائیوں کے بارہ دو ہزاروں بچے ہوئے کہ اب ان میں سے ایک بیٹی اس طرح اس کے اغراضات زیادہ تھے۔ بڑے دونوں تو اسکول جانے لگے تھے لیکن تمدنی اس کی فرقان اور عمران دونوں سے کم تھی۔ تین وقت کے کھانے کے علاوہ پھل، روٹ وغیرہ میں ملنا تھا اس کا حصہ زیادہ رکھتیں۔ اسی طرح تمام بیویوں کو ایک خاص حد تک ذاتی شاپنگ کی اجازت تھی، چاہے ان کے پاس ہزاروں روپے بھی کیوں نہ موجود ہوں۔ ان کڑے اصولوں نے گھر میں کبھی کسی قسم کی چیقلش پیدا ہونے کی گنجائش نہ دی تھی۔

سایس سسر اس کا سہرا اپنی بڑی بہو کے سرماندہ تھے لیکن فرقان کو اس میں بیوی کی حیثیت سے کوئی خوں نہ نظر آئی۔ اس کے حکم سے سسر سے روچا تھا اس کی ہمہ وقت چڑھی بھنوں میں اسے زہر لگی تھیں اور اس کا چومیں چھنے اور گھر اور گھر داروں کی فکر میں پاگان رہتا اسے سخت برا لگتا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان موجود اس سرد مہر اور گریز کو سب محسوس کرتے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

اقربان اور مہ پارہ بھی ہم عمر ہی تھے لیکن اپنی بڑی
سختی کی طرح مہ پارہ بھی عمر سے چند سال بڑی ہی نظر
آتی تھی، غصہ اس کی بھی ناک پہ ہی دھرا رہا تھا لیکن
مہ لقا کی طرف اس میں گہرواری کار، چنان کم تھا اس کی
پاؤں پی ویلر اسوہ کی طرف زیادہ تھی۔ اس نے ٹی۔ ایڈ کر
رکھا تھا لیکن سلسلہ کرنے کے بجائے گھر میں ایک
یونیشن سینٹر کھول رکھا تھا کہ بقول اس کے سرکاری
نوٹری میں سرکھپائی زیادہ ہے اور معاوضہ کم جبکہ
یونیشن سینٹر کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسے بنورے
جاسکتے ہیں۔ اس سے اس کی فطرت کا بخوبی اندازہ ہو
سکتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں پیسے کو اولیت دینے والی
تھی لیکن پیسہ حاصل کرنے کے لیے عقل ہنر اور
محنت کے ساتھ ساتھ لگن کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ
بات اسے کوئی سمجھا نہیں سکتا تھا، حتیٰ کہ بڑی باجی بھی
نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو محلے کے چند ایک بچوں
کے علاوہ کوئی اس سے بڑھنے نہ آتا تھا۔ اس کے اپنے
پانچ بچوں نے ہی اس کی مت مار رکھی تھی۔ اپنے
استاذ نہیں یہ توجہ دینے کا وقت کہاں سے ملتا حالانکہ
گھر میں اتنے لوگ ہونے کی وجہ سے اس پر کام کا دباؤ
کم تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے بڑی باجی نے ہر بار جڑواں
بچوں کی وجہ سے رعایت دیتے ہوئے کم سے کم ذمہ
داری اس پر لگا رکھی تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ اکثر
ساری رات بچوں کی وجہ سے جاگنے کا بہانہ کر کے دن
بھر کمرہ بند کر کے سو لی رہتی اور بچے وہ سنبھالتیں جو ان
کی ہچکیاں بھی تھیں اور خالائیں بھی۔

آئینہ کے بعد رضی اور وحی ہوئے تو دونوں چھوٹی بہنیں بیاہ کے آئیں۔ نئی نویلی دلنیں سارا دن ریں ریں کرتے۔ بچے ہی اٹھائے پھرتیں۔ بڑی دونوں اپنی مائی سے مانوس تھیں۔ وہ ان کے کمرے میں ہی کھسی رہتیں۔ یوں بھی نہ اور مادران کے اہم مرتبے اور کلاس فیلو بھی غاروں میں لاسکی آپس میں خوب بات۔

مہ جیسے عمران سے دو سال پہلے تھی لیکن عمران
اور مہ ناز دونوں ہم عمر تھے۔ عمران اور مہ ناز کی طرح
ان میں عمر کا یکساں ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ایک تو
جبران ماشا اللہ لمبا چوڑا بہت تھا دوسرے اس کے بال
نوجوانی میں ہی گرنے لگے تھے دونوں طرف سے نظر
آنے والے چوڑے ماتھے نے اسے ذرا بڑی عمر کا ظاہر
کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوپر سے مہ ناز چھوٹی موٹی سی بوٹا
ساتھ رکھنے والی لڑکی تھی۔ رنگ اس کا سانولا اور نقش
بھی عام تھے لیکن چہرے پر غضب کی معصومیت اور
نرمی تھی یہی نرمی اس کے لیے میں بھی تھی اور

عادتوں میں بھی۔ اگر گھر کا ماحول پر سکون بنائے رکھنے میں بڑی بسو کا زیادہ ہاتھ تھا تو چھوٹی بسو نے بھی اگر گھر کے ماحول کو مثالی بنانے میں خاصا اہم کردار ادا کیا تھا ایک کے مزاج کی سختی سب کو درست رکھتی تو دوسری نے مزاج کی نرمی سب کو شانت رکھتی۔

اور اب مفتی کے بعد اچانک ہی مہراں کی دلچسپی اس گھر سے اور بڑھ گئی۔ اس نے ماہِ گل سے اپنی دوستی کو استعمال کیا اور آئے دن چاکلیٹ، کمانیوں کی کتابیں لے کر وہاں جانے لگا۔ ماہِ نور اگرچہ اس کے سامنے کم ہی آتی لیکن پل دو پل کا سامنا بھی دونوں کو خوشگوار سا احساس دے جاتا اور مفتی کے تیسرے مہینے ہی جب ماہ

تور کے ٹانہ فائیڈ میں جھٹکا ہونے کی اطلاع ملی تو تو فوراً
امی جان کے ساتھ اپنی بیوی والی سسرالی جاکے بنیاد ہزار
کوششوں کے بعد بھی وہ اس کی ایک جھلک تک نہ
دیکھ سکا۔

پچھلے آدھ گھنٹے سے وہ گرم ترین برآمدے میں بیٹھا راحت کی دایاں سن رہا تھا۔ گرمی اور لو نے پسینے چھڑا رکھے تھے تو اس کے مسلسل اندر چلنے کے اصرار نہ

میران کے چھکے چہرے اڑ گئے تھے۔
”یارِ اتم! سمجھتا کیوں نہیں۔ مجھے زکام ہے۔ اندر
اے۔ سی میں میں نہیں بیٹھ سکتا۔“ اس نے کہا۔
بنایا۔

”مرے یہ تو جنم کی آگ پھینک رہا ہے اندر چل میرے پار کمر اٹھتا بھی ہے پر سکون بھی آرام سے بیٹھ کر کوئی موی دیکھیں گے۔“

”یار اس کھلی فضا میں۔“ وہ شاید موسم کی شان میں کچھ اور قصیدہ پڑھتا لیکن راحت کا میٹر تو لفظ ”فضا“ پہ ہی ڈالوں ہو گیا۔

”مرو تم اس ”برقضا مقام“ کے مزے لوٹتے ہوئے میں باز آیا ایسی مسلمان نوازی سے۔ میں تو اندر جا رہا ہوں۔ تمہاری مرضی اپنے کھر جانو یا پھر یہیں میرے کمر کے ہر قدم میں نیچے نیچے گاتے رہو۔“

”موسم ہے عاشقانہ۔ موسم ہے عاشقانہ۔“

مہمان نے اس کی بات میں گرہ لگاتے ہوئے تین بلند کی وہ واقعی اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اسے دل نہیں ہے ان کو ایسے میں ڈھونڈنا ایسے میں ڈھونڈنا۔“

اندر جانے کے ارادے سے مڑتا راحت ٹھٹھا۔ گانا اس نے اپنے اپنے گیت کے شروع کیا تھا لیکن سوز اور قہر کی آواز نہ تھی۔ اس نے شوقی نظروں سے اسے دیکھا اور وہی ہے قرار نہیں گیت پہ جہی تھیں، نا اہل پہ رہی نا اہل اسطرلابی کیفیت میں مل رہی تھی اور مدھم سوتی آواز کے ساتھ گنگنا ماوہ خود بخود انتھار بنا ہوا تھا۔

”اے دل نہیں ہے ان کو۔“ اور ساتھ کال بیل کی خوشگوار سی چکار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئی۔

راحت کی مشکوک اور سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے بے ساختہ پھیلے لب بے شکل سمیٹے اور جگنو کی سی چمکتی آنکھوں میں زمانے بھر کی معصومیت سمیٹتے ہوئے وضاحت کی۔

”تمہاری کال بیل کی آواز مجھے بڑی مدھر لگتی ہے، دل کے تاروں کو چھینٹتی ہوئی، گنگنائی ہوئی۔“

راحت نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے قدم گیت کی

جانب پڑھا۔

”تم سے کچھ بعید نہیں میرے بھائی، تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں اگر یہ سزا ہوا موسم عاشقانہ لگ سکتا ہے تو یہ منحوس چیں چیں بھی مدھر لگ سکتی ہے۔ گیت کھولتے ہی اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔ جیسے ساری بات سمجھ میں آئی اس نے پیچھے مڑ کر اسے بدو دیکھا۔

کریدتے انداز یہ مہمان قدم سے سٹپٹا۔ راحت نے مسکراتے ہوئے اسے بعد میں نمٹنے کا اشارہ دیا اور باہر متوجہ ہوا۔ جہاں گرمی سے گھبرائی ہوئی معطر کھڑی اسے حیران نظروں سے تکتی رہی تھی جو اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے نجانے کون سے مذاکرات نمٹا رہا تھا۔

”او مٹھو! او۔“ اس نے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے معطر کو اس کے پار کے نام سے پکارا تو بے ساختہ اس کی گھبرائی گھبرائی نظریں برآمدے کی چیمڑ پہ بیٹھے مہمان کی طرف اٹھ کھیں جو اس کے اس نام کو بغور اور انجوائے کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے لبوں کی مسکراہٹ ”مٹھو، مٹھو“ پکار رہی تھی۔

”وہ راحت بھیا! آج میرا پیپر تھا سیکنڈ ٹائم کا، می نے کہا تھا کہ اگر جلدی فاسغ ہو جاؤ تو ماموں کی طرف چلی جانا، دوپہر کو اتنی دور تک وگین میں سفر مت کرنا۔ اس لیے میں۔“

”بھئی، جب مرضی آو، تمہارے ماموں کا گھر ہے بلکہ چلو اچھا ہے کوئی تو بہانا بنا تمہارے یہاں آنے کا۔“ وہ معطر کا زورس ہونا بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔ ”ویسے بھی میں نے تم سے کب پوچھا۔ میں تو کسی سے بھی نہیں پوچھتا۔“ آخری جملہ اس نے مہمان کے قریب آکر آہستہ سے کہا تھا۔ خطرے کی گھنٹی سر پہ بجتی دیکھ کر وہ فی الفور اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم اندر داؤد کے کمرے میں چلی جاؤ مٹھو! امی تو گھر پہ نہیں، اگر بھوک لگے تو کھانا دانا خود نکال کر کھاؤ۔ مینا تو دوپہر کو اسطبل پہنچ کر سوتی ہے۔ اس کے آسرے پہ مت رہنا۔“ راحت کی تاکید پہ وہ مسکرائی تو جیسے مہمان

کو سچ آدھ گھنٹے کی گرمی اور جس کی کوفت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔

”میں جانتی ہوں راحت بھی! لیکن مجھے فی الحال بھوک نہیں ناشتہ دیر سے کر کے گھر سے نکلی تھی۔“

”جاؤ پھر اسکو اش بناؤ اور ایک جگہ ہم دونوں کے لیے بھی لے آؤ۔“

”مگر یہ کونسا راستہ ہے؟“

”جانتے ہیں۔“

”تم کہاں چل رہے ہو؟“

”میں نے یہاں سے نکلتے ہی دیکھا کہ ایک گاڑی آ رہی ہے۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”کونسی گاڑی؟“

”ایسا نیسین۔“

”ایک بار کہہ چکا ہوں کہ اب اور ایک گنگ بند کر دو۔“

”مہران نے جھٹکا کر اسے کشن دے مارا۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولتا رہا۔“

”یار! تم بھی کمال کی چیز ہو مگر میں نے بھی تمہارے چہرے کی بازی کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ مجھے تو رونق پہلے سے برہہ کر نظر آ رہی ہے۔“

”اب ہر کسی کے نصیب میں کہاں یہ ٹھنڈے جھونکے۔ ہمیں تو ٹھنڈے پانی کا ایک شاہر لے کر ہی خواہ ٹھکانے لائے ہوں گے۔“

”وہ تو لپٹے کاغذ پر رکھتا داش روم میں نفس کیا اور مہران نے تکیے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں اسکو انش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی مہربانی تھی۔ عرصہ بعد اسے دروازے پر کمر نکالی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔“

یونیفارم میں تھی سفید لباس میں دھوپ کی تمازت سے تھماتایا چہرہ بے حد سرخ لگ رہا تھا۔ اب اس نے ایک ڈھیلا ڈھانا سالان کا سوٹ پہن رکھا تھا جو غالباً مینا کا ہو گا۔ اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد تولیے سے پونچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی ہلکی ہلکی سی نمی کے آثار گائول پہ نمایاں تھے اور ماتھے کے ذرا اوپر بالوں پہ چند شہرے قطرے بھی دکھ رہے تھے۔

”بھئیے!“ گلاس اس کے سامنے ٹھیل چڑھ کر رکھ کے وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہرین دوبارہ کوئی بہانہ بنا کر اسے کچھ دیر اور روکنا چاہتا تھا لیکن واش روم سے مسلسل آتی جستے پانی کی آواز ایک دم خاموش ہوئی تو اسے خود یہ ضبط کر لینا پڑا۔

بہر حال یہ اپنی اپنے قرار کی وجہ سے معطر کی ناراضی
 انورہ نہیں۔ سکتا تھا اور معطر سب میں سے معاہدے
 میں حد سے زیادہ تھیں اور ممتاز تھی اسی لیے اس کا
 رابطہ مہران سے صرف ان عیدوں اور عیالیوں کا ترک
 محدود تھا اور آج کی بات کے بعد مہربان اور صرف اس کی
 ضد اور اسرار کے ہاتھوں تک آئے وہ یہ رونا نکالتے
 پھیر رہی تھی تاکہ مہربان کے اسے ایک کتاب لکھ لیتے
 کی خواہش تھی پوری ہو جائے۔ اس کی جیسے
 امتحان سے بھی نہ ان راز سے اس کے لیے میں اس
 کے خرواہوں کا اس کی فائستہ اختیار نہ کیا ہے اس
 کی شیخ اور تہرے ہونے شخصیت کے پردے میں
 پوری آب و تاب کے ساتھ جگہ گاہ یہ نسو لٹی و قار رہی تو
 مہربان کہ بھایا تھا۔ اسے آج بھی اپنی اور اس کی پہلی
 ملاقات یاد تھی۔

بات زیادہ پرانی نہیں تھی بلکہ مہران کو تو جیسے کل کا واقعہ لگتی۔ ایسا ہی ہوتا ہے، دن جب خوشگوار ہو جائیں، سیر جب سبک ہو جائیں اور راتیں خواب بننے میں لگنے لگیں تو ایسا ہی ہوتا ہے اور ایک وقت وہ بھی تھا جب اسے تمام شب دروز ایک جیسے لگتے تھے۔

جامد تھکے ہوئے، طویل سے اور اکتائے ہوئے۔

یہ بھی ان ہی مشکل دنوں کا ذکر ہے۔ ماہ نور کی وفات

یہ بھی ان ہی مشکل دنوں کا ذکر ہے۔ ماہ نور کی وفات

سری تو الیاں سننے کا۔

”چھا میری توبہ جو اب میں نے چوں کی آواز بھی نکال اپنے منہ سے لیکن تجھے بھی قسم ہے میری دوستی کی کہ اپنی بہن کی خوشی میں تمام رسموں میں پورے دل کے ساتھ شریک ہونا پڑے گا۔“ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مہراں کو آتے ہی بی۔

”اوتیرے منہ سے دے دے تھے۔“

مسرت نذر کی آواز میں اس مشہور پنجابی گیت کو وہ کئی بار سن چکا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس میں اتنا ہنسنے والی بات کون سی ہے۔ کافی دیر سے پر آمدے میں بیٹھا وہ گیت کے ان یوں کی تکرار بھی سن رہا تھا اور ساتھ ہی بے ساختہ اسٹڈنٹس والے قمیصوں کو بھی۔ ہنسی کا طوفان ذرا سمٹتا تو پھر سے ایک لڑکی نے دفلی پہ تال مارتے ہوئے آواز بلند کی۔

”متھے تے بندیں۔“ ابھی وہ یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ پھر سے سی کھی کھی کھی اور باہا باہا شروع ہو گئی۔ اندر سے نشاط بانی پیر چنتی نکلیں۔

”منع کر لو ان سب کو راحت ورنہ میں ابوجی کو بتا دوں گی۔“ وہ رو باکی ہو رہی تھیں۔ راحت بھنس کے اپنے اناخت اندر نہیں جانے تھے۔ سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”باتی! میں سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ کیوں چڑ رہی ہیں۔ اب یہ ہنسی مذاق تو چٹائی ہے ناں۔“ وہ ناراض ناراض سی بہن کوشانے سے تھمتا اندر لے گیا اور جانے کیا کہا کہ کچھ دیر کے لیے ہنسی کا طوفان ختم گیا۔ خود باچھیں چیرتا تھوڑی دیر بعد ہی اٹھیا۔

”بڑی بد تمیز ہے یہ بیٹا بھی۔ سارا شوشا اسی نے چھوڑا ہوا ہے۔“ پھر مہراں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگا۔

”یار! دراصل یہ جو منور بھائی جان ہیں میرے ہونے والے بہنوئی، بالوں کے معاملے میں ذرا ہاتھ تنگ ہے ان کا ماتھے سے کافی آگے جا کر حدود شروع ہوتی ہیں۔ اسی لیے۔“

اور مہراں کو ”متھے تے چمکس بال“ پہ لڑکیوں کا

رفتہ نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا۔ راحت جانتا تھا کہ اس کے اہلی کی طرف سے تمام بیٹوں کے دوستوں کا گھر تک بلا وجہ آنا ممنوع ہے اس نے اس بات کا بھی برا بھی نہیں مانا تھا لیکن مہراں کی پشیمانی اس سے دیکھی نہیں جانی تھی۔ وہ کھینچ کھانچ کے اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ نشاط بانی، امی جی سب ہلکی پھلکی گھنگو کے ذریعے اس کا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے۔ سب ہی اس گھر اپنے چکر کرنے والے ساتھی سے واقف تھے اور واقعی چند گھنٹے سب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ خود کو برا بھلا کہا کرتا لیکن گھر آنے کے بعد وہی افسردگی اور یاسیت کی لہر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

راحت کے گھر شاہی کی تیاریاں زوروں پہ تھیں۔ آج شام میٹھا کے بعد ڈھولک رکنے کا پروگرام تھا۔ راحت اپنی امی جی کے ساتھ اس کے گھر، موٹی ہارڈ ویٹے آیا تھا۔ امی جان اور بھابیوں سے، میٹھا میں شریک ہونے کے پر زور اصرار کے بعد اس نے مہراں کو رات ڈھولک کے لیے غنیمت کی تھی۔ تائید کی۔ بھابیوں سے تو اس نے ”میں رات میں شوشا ہونے کے لیے نہیں کھاتا“ کہا اور برا سمجھ کر کہیں کیونکہ مہراں کا کہنا تو یہی تھا کہ ”میں شوشا نہ ہوں۔“ اور چنتی بہن کے دھتکت نکال نہیں دیتا۔

”تمہارا دل غراب ہے؟ میں اس ماہ میں گھر پاؤں اور زمانہ محفل میں کیا کروں گا؟“ مہراں نے اس کے اصرار پہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ڈھولک پہ چھپ بجاؤ گے آرت۔ یار مل بیٹے کا ہرانا ہے یہ سب اور کیا۔ سب یار دوست مل بیٹھیں گے؟“ گپ شپ لڑنے کی چائے تھوے کا دور چلنے کا، بیک گراؤنڈ میں لائو میوزک الگ سے بج رہا ہو گا۔ بنو تیرے لبا کی اونچی جوتی۔ بنو میں ایشیاں چنتا آیا۔“ وہ بھانڈوں کی طرح نالیاں پیٹنے لگا تو مہراں نے ناگواری سے اسے گھورا۔

”یہی حرکتیں اگر تم نے رات کو بھی کرنی ہیں تو میرے آنے کی امید مت رکھنا۔ مجھے شوق نہیں ہے

کھلکھلا نا سمجھ میں آگیا۔ اس نے بے ساختہ وارو ہوئی مسکراہٹ کو منہ پھیر کر چھپایا۔
 ”پھر بھی یہ ہے تو بد تمیزی۔ تمہیں سختی سے منع کر کے تنہا تھا جتنا کہ پجاری نشاط بائی کو کتنا برا لگتا ہو گا۔“

”میں نا کوئی ایسی تو ہے نہیں جو میں اسے ڈپٹ کر چپ کرادوں۔ مجھے کا جتن ہے اس کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر مٹھو“ اس کی مودودی میں سب ہی لڑکیاں شیر ہوئی بیٹھی ہیں۔“

”اچھا چلو ایسا کرتے ہیں گھسنے کے بول بدل لیتے ہیں۔“ ایک شخص خوشگ سی آواز نے رائے دی۔
 ”مجھے تے ٹالوں ٹالوں (کہیں کہیں) اکا دکا (یاں میرے ہنر ہے۔“

”بس کرو“ میں اب تم سب کو مارنے لگوں گی۔“
 بچی نے دھاڑ کر چپ کر لیا۔

”ہم کیا کریں بائی! میاں میں آپ جی نے ایسی اچھی باتیں بتائی ہیں اب جھوٹا بولنے کی بات ہی نہیں کرتا۔“ مینا کی منمنائی آواز پر سب نے تائید کی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں ابھی اور ایسی وقت اس متنازعہ گیت کو چھوڑ کر کوئی اور گیت شروع نہ کیا تو میں یہ مقدمہ ابوجی کے پاس لے جاؤں گی۔“ اس دھمکی کے ساتھ ہی ڈھولک کی تھاپ گونجی اور کورس بچھا شروع ہو گیا۔

”بیجا جی بیجا جی“

بھولے بھالے بیجا جی۔“

شروع سروی کے دن نصف ابھی خشکی اتنی بڑھی نہیں تھی۔ راحت نے نادر اور شعیب کے ساتھ مل کر ٹائٹ ہسٹ منانے کا پروگرام بنا ڈالا۔ بارے جوش کے سب لڑکوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مہراں کو پتنگ بازی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ وہیں برآمدے میں ٹھس سا بنا بیٹھا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ نادر فوراً سے پیشتر اپنی موٹر سائیکل اشارت کر کے گھر سے نکلیں اور گڈے لینے چلا گیا تھا۔ شعیب اور یاسر دری کریاں اور ڈیک تھمت پر پہنچا رہے تھے مظہر کو

سرج لاسٹ کا انتظام کرنے بھیج دیا گیا تھا اور خود راحت اسٹور میں سے پچھلے سال کی ہسٹ کے نیچے کچے ماسچے گڈے لنگوارا تھا۔ سب کی افزائش پر بھانگم ڈوڑ اور سب سے بڑھ کر پیچھے کے کمرے سے آتی۔
 بھری آوازوں اور ڈھولک کی تھپ تھپ نے اسے اتنا بیزار کیا کہ وہ اٹھ کر برآمدے کے دوسری جانب چلا گیا جہاں کچن کی کھڑکی اور بیرونی دروازہ کھلتا تھا۔ برآمدے کے ایک طرف بنجرے میں اوہڑ ز رکھے تھے۔ اس نے جانی کو بلکا سا تپتیا یا مگر ایک بھی بنجرے میں رکھے گئے مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھڑو نہیں سے باہر نہ نکلا۔

”میں نہیں۔“ طوطے کی کراری آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کرل کے دروازے پر لٹکے لکڑی کے خرشٹیاں تختہ سے بنجرے میں بسی سی سبز اور پیلی دم والا طوطا پھدک پھدک کر اسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ مہراں اس کی طرف بڑھ گیا۔

”مٹھو! میاں مٹھو! چوری کھاؤ گے“ میاں مٹھو۔“ وہ آہستہ آواز میں اسے پکارنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔ ایک رُرونی اور بھرپور۔ میں قدرے تاریک اور تنہا گوشے میں ایک مٹھو دم سے زری رنگ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنا اسے عجیب ناراض سا لگا۔

”مٹھو“ مٹھو نے کیا کھانا ہے ”بسکٹ“ وہ طوطے کو پتہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا بسکٹ توڑ کر بنجرے میں ڈالنے لگا تھا کہ ایک خفگی بھری آواز پر بری طرح چونک گیا۔

”بد تمیز شرم تو نہیں آتی اس طرح۔“ کچن کی کھڑکی سے کسی لڑکی جیسے حد جارمانہ انداز میں اسے لٹاڑنا چاہا لیکن پھر اس کی حواس باختہ سی شکل ہاتھ میں پکڑے بسکٹ کے ٹکڑے اور سامنے لٹکے طوطے کے بنجرے کو دیکھ کر رک گئی۔ خجالت کے رنگ اس کے نکھرے چہرے پر صاف نظر آرہے تھے۔

مہراں کافی دیر کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں ہکا بکا کھڑا رہا پھر دفعتاً لڑکی کے ہاتھ میں پرنس کو کونٹ

اپنی ساری شانگ کر لیں۔

”کوئی کیسٹ آن کریں ناں بھیا۔“ مینا کی فرمائش پہ اس نے آن کر دیا ویسے بھی چاروں کی جھٹو پڑے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ گلے کی آواز میں کم از کم ان کی آوازیں کچھ تو ب جا ئیں گی۔

ہاتھ سے ہاتھ کیا کیا
دل تیرے ساتھ کیا کیا

شیراز کی مختصر سی فضا میں گلوکار کی پرسوز آواز گونجی۔

تو نہیں

تیری چوڑیوں کی کھنک

اب بھی سنتا ہوں دل کی دھڑکن سے

تیرے آنچل کی ست رنگی دھنک

جائیں پائی میرے آنگن سے

مینا نے بڑی گہری نظروں سے پہلے اسے اور پھر پیچھے مڑ کر مٹھو، پہلی اور روا کو دیکھا۔ اس کے اس جتانے والے انداز کو مہراں نے سرسری سا لیا اس کا سارا دھیان تو ڈیوس روڈ کی پُر ہنگم ٹریفک کی طرف تھا۔ میوزک کے شور نے ان چاروں کی گفتگو بہ ہم کر دی تھی اس کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا ورنہ اسے دوران ڈرامیوٹک میوزک سننے کا کوئی خاص شوق نہ تھا اور وہ بھی اس طرح کی مڑکوں پہ۔

”مہراں بھیا! آپ ہنسنا بولا کریں یوں جب چاپ کب تک؟ میرا مطلب ہے ایسے تو زندگی نہیں گزرتی۔“ اس نے پارکنگ میں کار کھڑی کی تو مینا باہر نکلتے نکلتے رک کر بڑی دل سوزی سے اسے مشورہ دینے لگی۔ اسے ہنسی آگئی لیکن بظاہر سنجیدہ ہو کر اسے ڈیٹا۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ چلو اترو اور جلدی سے کام نمٹا کر آؤ۔“ اب وہ اسے کیا بتا تاکہ اس انجان لڑکی پہ پہلا پڑنے والا غلط امپریشن اس کی سنجیدگی اور بے وی رہنے والے انداز سے ہی ڈائل ہو سکتا تھا۔

”لیکن میں اس پہ اچھا امپریشن ڈالنا ہی کیوں چاہتا ہوں؟ میری ہلا سے وہ جو چاہے سمجھے۔“
دل کی بے گئی احتیاط پہ اس نے خود کو جھڑکا۔ واپسی

کو کیز کا ڈپہ دیکھ کر ساری پچویشن سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرنا لڑکی خود ہی منظر سے اوجھل ہو گئی۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود اسے اپنی پوزیشن بڑی آگورڈ سی لگی۔ ہر حال دوست کا گھر تھا اور خوشی کا موقع۔ تنجانے یہ لڑکی راحت کی لون تھی۔ کہیں کوئی غلط فہمی معاملہ بگاڑ نہ دے۔ وہ مخالف ہو کر اوپر بسنت کی تیار یوں میں شامل ہونے چاہتا تھا۔

اچلی شام اتفاقاً ”راحت“ کے میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا سب سے پہلی لڑکی سے ہوا۔ پوریج میں، شہر والے، دلچسپ، نا اراست میں کم تھی۔ یہ لڑکی اسے دیکھ کر چلنے سے روک کر مینا کی آواز تھی۔

”بھیا! اے ان بھیا۔“

وہ رکت کر رہا تھا، دیکھنے لگا۔ آواز رکشہ میں سے آ رہی تھی۔ اچھا، ایک رکشہ خالی ہوئے تھے۔ مینا نے احمد رو اور لڑکی لگی آگیاں لے کر باہر نکل پڑیں۔

”امم ان بھیا! تمہارے منہ پر اور منہ پر بے ساتھ چوتھ۔“ اس نے غصہ سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا۔ ”تیرے رات ہوئے۔“ اس نے سر دھونے لگا دی۔ دل اس دن میں بے حد غم تھا۔

(اور تو اس قدر چاہنے کی وجہ سے کہ وہ مصروفہ اپنا نام مٹھو نہ تباہ کر دیتی ہو گی، کوئی کہ میں اس کے ساتھ پیچھے چھوڑ کر رہا ہوں اس خیال کے آتے ہی وہ سنبھل سا گیا۔ اگرچہ سورج حال اسی وقت کلیئر ہو گئی تھی پھر بھی اسے اپنا انتخاب سنا کر چھٹی تھا۔)

”چلیں مہراں بھیا! ہم سب کو مارکیٹ لے جائیں۔“ وہ پورے استحقاق سے کہتی ہوئی اسے واپس گاڑی کی طرف لے جانے لگی۔

”اور تم اپنا رکشہ بے شک واپس لے جاؤ۔ بڑا آیا۔ چار چار سواریاں نہیں بٹھاؤں گا۔“ وہ منہ اور آواز بگاڑ کر بولی تو مہراں نے سرزنش کی۔

”بڑی بات مینا! یوں ہر کسی سے نہیں اچھتے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چاروں لڑکیوں کو مارکیٹ لے گیا۔ اس الٹی میٹم کے ساتھ کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ

پر مینا کے ساتھ ساتھ باقی تینوں لڑکیوں کی غیر معمولی
شجیدگی اور خاموشی پر وہ کچھ کھٹکا۔ ذرا گردن گھما کے
پچھلے دیکھ لیتا تو یقیناً "ان سب کی آنکھوں سے جھانکتا
ترخم اسے مزید الجھا دیتا۔

اگلے دن وہ قصداً نہ گیا۔ دو دن ہی خوب جی بھر
کے بور ہو لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب شادی
کے دن ہی جائے گا چاہے راحت کتنا ہی اصرار کیوں نہ
کر لے۔ رات گئے فون کی بیل نے اس کی محبت
توڑی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا رسل کرو کی نئی مودی
(A Beautiful Mind) میں کھویا ہوا تھا۔ (یہ
پونے ایک بجے کس کا فون ہو سکتا ہے) اسی الجھن
میں اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے موصول
کر وہ تعارف نے اسے اپنی جگہ سے اچھلتے پہ مجبور کر
دیا۔

"میں ماہ نور بول رہی ہوں۔"

"جی؟" وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

"میں ماہ نور بول رہی ہوں مہراں۔" اس گندہاتی
ہوئی سی آواز میں جیسے شہر خفا ہوا تھا۔
"کون؟ کس سے بات کر رہی ہے آپ؟" کوئی ایک
ماہ نور تو نہیں زمانے میں۔ اس خیال کے تحت اس
نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پھر پوچھا۔

"ماہ نور اور کس سے بات کرنا چاہے گی؟ غلام ہے
مہراں سے۔ جو اسے اتنی دور سے بلالایا ہے۔ مہراں
کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ "مگر یہ شرارت
ہے تو بڑی ہی گھٹیا۔ لیکن یہ کون ہے جو اتنا قریب
سے جانتی ہے مجھے۔" یہ سب سوچتے ہوئے اس نے
خفی سے سوال کیا۔

"محترمہ! آپ کون ہیں؟ رات کے اس پھر کسی کے
گھر فون کر کے بے مقصد گفتگو کر کے کیا ثابت کرنا
چاہتی ہیں۔"

"میں کہ میں ماہ نور ہوں۔ میں لوٹ آئی ہوں۔ کسی
کی بے قراری، اواسی اور تڑپ مجھ سے دیکھی نہیں
گئی۔ میں نے خدا سے اپنی زندگی دوبارہ مانگی اور لوٹ
آئی۔ کیا میرا یقین نہیں کرو گے مہراں۔"

"تو اس بند کرو۔ مجھے کیا باطل سمجھ رہا ہے۔"
اس کی بے تکلی باتوں پر مہراں کو اشتعال آگیا اور وہ یہ
جانتے ہوئے بھی کہ اس کی مخاطب ایک لڑکی ہے اس
لمحے میں بات کر بیٹھا۔

"اگر مذاق ہی کرتا ہے تو اس میں کسی مرے ہوئے
شخص کو استعمال تو مت کرو۔ کم از کم اتنا احترام تو تمہیں
کرنا چاہیے۔" اسے واقعی اس سنگین مذاق سے
تکلیف ہوئی تھی۔

"مرے ہوئے شخص کا احترام؟" دوسری طرف
سے بڑے الجھنے کے ساتھ دہرایا گیا۔ "کیا ماہ نور اب
اس دنیا میں نہیں؟"

"نہیں، ماہ نور کو گزرے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور اب وہ
کبھی واپس نہیں آسکتی۔" اس نے اس مذاق کرنے
والی کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"میں تو آپ کو سمجھانا چاہتی تھی میں مسٹر مہراں۔"
اس کا لہجہ اتنے نرم سے ہو گیا۔ "کہ میں ماہ نور نہیں ہوں
۔ کوئی شخص ماہ نور میں جو ملتی ہیں کسی اور کا نام ماہ نور
نہیں دے سکتا ہے۔ وہ نہیں ہوئی کیونکہ ماہ نور
ایک ہی انسان اور اب وہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کبھی واپس
آ سکتی ہے۔ اب آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں تو پھر اسے
تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ ماہ نور کو آپ کسی بھی طرح
واپس آنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔" فون بند ہو چکا تھا
لیکن ریسیور ہاتھ میں لیے وہ کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

وہ کون تھی؟ کیا کرنا چاہتی تھی اور کیا کہہ رہی
تھی۔ سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پہلے تو وہ اسے
کسی پھیلے حس مزاج رشتے والی لڑکی کا اچھا سا مذاق
سمجھتا تھا لیکن اب اسے بات چٹھ اور بھی لگ رہی
تھی۔ اس نے اپنا تعارف جس انداز میں کرایا تھا تب
غصے اور حیرت کی شدت نے اس کا دماغ تقریباً "ماؤف"
کر دیا تھا اور اس نے کسی بات کی طرف دھیان ہی
نہیں دیا تھا۔ اب ایک بات بھی جو اسے کھٹک رہی
تھی "اندر کہیں ایک لازم بچ رہا تھا لیکن وہ پورے
دشوک سے کہہ سکتا تھا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہا
ہے ویسا واقعی ہے بھی یا نہیں۔ اگر اس وقت بات

کرتے ہوئے وہ دھیان دے لیتا تو شاید کوئی سراہا تھ
آجاتا۔ خود سے الجھتا وہ سو ہی گیا۔

اگلی رات اسی وقت ٹھیک ایک بجے اسے پھر فون
کی بیل سنائی دی۔ دن بھر چاب کے لیے بھاگ دوڑ
میں مصروف وہ رات کا واقعہ تقریباً ”بھلا چکا تھا“ اس
لیے نوٹس نہ لیا، تیسری بیل پہ جب اس کے ذہن میں
جھماکا ہوا اس نے وال کلاک پہ ٹائم دیکھا اور جلدی
سے سینپر منتہا کمرے سے نکلا۔

لقمان بھائی بن گیاں لیتے لاؤنج سے نکل کر واپس
اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ فون یا تو بند ہو گیا
تھ یا پھر کسی نے ان کی آواز سن کر لائن کٹ دی تھی۔
وہ بیل کی آواز نہ کرتے ہوئے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ اس
یاد اس نے نہ کہ اسے انسان بھلاں رکھتے کا اثر دیا۔
جھپٹے فون پہ اس کے شعور میں جو ہلکی سی پس منظر کی
بازداشت رہی تھی وہ اس کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ ہلکی
سی بیل ہونے پہ اس نے ریسور اٹھالیا اور روم ساؤج کر
بغیر کچھ بولے سننے لگا۔ دور ہیں سے: ”تو تک کی مدھم
سی تھا ب سنائی دے رہی تھی وہ چونکا ہوا تھا۔

”ہیلو۔ کون؟“ ماہ نور؟“ اس نے جان بوجھ کر یہ کہا
تھا۔

”اف۔۔۔ آپ کب سمجھیں گے کہ ماہ نور کو آپ
اس طرح جوگ بے کرواپس نہیں آسکتے۔ آپ اسے
یاد رکھیں کسی اچھی بات کی طرح نیلن اس یاد گونا سور
مت بنائیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی زندگی
گزار کر آپ اس کی روح کو کوئی تسکین دے رہے
ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر
اسے یقیناً ”تکلیف ہو رہی ہو گی۔“ وہ کیا کہہ رہی
تھی۔ اسے خبر نہ تھی ساری توجہ اس جانب تھی کہ وہ
کہاں سے بول رہی ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس
وقت اکیلی نہیں بلکہ اس کے ارد گرد اور بھی لڑکیاں جمع
ہیں جو اسے مختلف مشوروں سے نواز رہی ہیں۔ ان کی
آوازیں مکھینوں کی جھنجھٹا ہٹ کی طرح اس تک پہنچ
رہی تھیں۔

”آپ کی یہ حرکتیں۔۔۔“

”کیسی حرکتیں؟“ اچھی طرح مطمئن ہونے کے
بعد مہران نے اب اس کی گفتگو کی طرف دھیان دیا۔
”یہی او اس رہتا، کم صم چپ چاپ بیٹھے رہتا، زندگی
سے بیزار رہتا اور کما کما کر اسے آٹا ہٹ، خوشیوں
سے ناراضی۔ البتہ گیت سننا۔“ اس کے آخری
حوالے پہ وہ بری طرح چونکا۔ اسے یاد آئے لگا کہ اس
شام گاڑی میں وہ سیڈ سوئچ لگتے ہی جینا کے تاثرات
بدل گئے تھے اور مارکیٹ سے واپسی پہ باقی لڑکیوں کا
رویہ بھی بدل بدل لگ رہا تھا۔

ہونہ ہو یہ ان چاروں میں سے ایک ہے اور یہ بھی
ممکن ہے چاروں کا ٹولہ ہی ہو۔ جینا احمق بھی ہے اور
شریر بھی لیکن اس طرح کا مذاق اور وہ۔ نہیں۔ ہو
سکتا ہے یہ سب اسی کی وجہ سے ہو لیکن یہ جینا نہیں ہو
سکتی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنے مہران، بھیا
سے اتنا سنگین مذاق کر سکے۔

”آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ رویہ آپ کو نارمل
زندگی سے دور لے کر جا رہا ہے۔“ اس کی خاموشی نے
لڑکی کی ہمت مزید بڑھائی۔ ”آپ ذہنی مریض بھی بن
سکتے ہیں بلکہ بن رہے ہیں۔ بات کرتے کرتے چپ
ہو جانا بھی اس کی ایک نشانی ہے اور بے زبان جانوروں
اور پرندوں سے اکیلے میں گفتگو کرنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے
کہ آپ اب انسان سے نامتد ہو چکے ہیں۔ دیکھیے یہ
غلط رویہ ہے۔ زندگی کسی ایک فرد کے جانے سے کم
نہیں ہو جاتی اور۔۔۔“ وہ بولتی رہی اور مہران نے
ٹھنڈی سانس بھر کے ریسور کو گھورا۔

جو بات وہ جانا چاہتا تھا اس نے بیڑوں کے پن میں خود
ہی اگل دی تھی۔ بچپن سے الٹی جان کے پالے ہوئے
کتوں، بلیوں، بطنوں، مرغیوں اور طوطوں میں رہ کر
اسے ان بے زبانوں سے انسیت سی ہو گئی تھی اور اس
رات طوطے سے باتیں کرتے ان چار میں سے صرف
ایک لڑکی نے ہی اسے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی۔ جو طوطے
کی ہم نام تھی اور شاید ہم عادت بھی۔ ابھی بھی ایک
تواتر کے ساتھ رٹا رٹا سیتا دہرا رہی تھی۔

”آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔“

”بچپنیں سال۔“ سنجیدگی سے نوک کربات کالی۔
اس کا سلسلہ کلام پھر سے بڑا۔
”وہی تو“ اس عمر میں جوگ لے لینا کوئی اچھی بات
ہے؟ آپ کی ذات پہ دوسرے رشتوں کی محبتیں بھی
فرض ہیں۔ کسی ایک کے عشق میں دنیا چھوڑ دینا
انصاف نہیں۔ ”وہ نبھانے کس غلط فہمی میں مبتلا تھی۔
کیسا عشق؟ کیسا جوگ؟ وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔
اچانک اسے شرارت سو گئی۔

”میاں مٹھو! چوری کھاؤ گے؟“
دوسری طرف زبان کو اچانک ہریک لگ گئی۔ مہران
نے ایسا سوال دہرایا تو لمبی سی ”ہائے“ کے ساتھ فون
رکھ دیا گیا۔

اگلے دن وہ بظاہر راحت کے ”پر زور اصرار“ پر
وہاں گیا تھا۔ حالانکہ رات کو فون بند ہوتے ہی اس نے
کل مایوں کی تقریب میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
اس کی متلاشی نظریں اس کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن
ابھی تک اس کی ایک بھی جھلک وہ دیکھ نہ پایا تھا۔ ایک
تو آج باقاعدہ رسم بھی مایوں کی اس لیے لوٹ بھی نہ وہ
تعداد میں تھے۔ دوسرے یہ کہ نشان بدلتی کے کمرے
کے بجائے لڑکیاں آج ہال میں جمع تھیں۔ وہیں رسم
ادا ہوئی تھی۔ اس وقت شاید اوجھڑ فضا دکھائی دے
مظاہرے ہو رہے تھے۔ اس لیے مردانہ داخلہ ممنوع
تھا۔

”یار مہران! بار اور گھرے ذرا اندر مینا کو پکڑا آ۔“
راحت نے اسے پہلے رنگ کے پھولوں سے بنے
درجنوں بار اور گھرے تھمائے اور خود جگلت میں ان کی
طرف لپکا جہاں نشستیں اس کی مرضی کے مطابق
سیٹ نہیں کی گئی تھیں۔ وہ پھولوں کا ڈھیر سنبھالتا ہال
کی طرف بڑھا۔

بتیاں، بھائی رکھ دی، میں بتیاں، بھائی رکھ دی
دیوالے ساری رات میرا ہانا
دیوالے ساری رات

کارپٹ پہ گول دائرے کی صورت میں بیٹھی تالیاں
بجاتی لڑکیوں کے ہجوم میں وہی تھی جو اس وقت

ہو رہے جوش کے ساتھ ڈانس کرنے میں مگن تھی۔
گرنز اور دوستوں کی متواتر ہنسی تالیاں اسے اور
پر جوش کر رہی تھیں اور اس کے گھر کتے پیر مزید محرک
ہو کر مال سے مال ملانے لگتے تھے۔ دروازے میں
ایسا نہ مہران نے بڑی دلچسپی سے اس کی سادہ مگر بے
ساختہ حرکات دیکھیں۔ کھلتے ہوئے پہلے رنگ کے
قمیص پائینجامہ کے ساتھ اس نے چڑی کا چٹا ہوا پیلا سبز
اور سرخ رنگ کا دیش لے رکھا تھا۔ دونوں کلاسیوں
میں بھر بھر کے ہم رنگ کالج کی چوڑیاں پہن رکھی
تھیں۔ رنگی بال چوٹی میں قید تھے، البتہ چند لیس
ڈانس کے دوران چہرے پہ گر آئی تھیں، ہلکے سے
میک اپ کے ساتھ وہ پہلے سے کہیں اچھی اور الگ
نظر آ رہی تھی۔

بھڑیلے توں راہواں نکدی

پادنی آں شالماں

نکال کر کر تھک گئی آں میں

سو خنیاں دانگ غلاماں

دونوں تھیلیاں جوڑ کر جب اس نے فٹیں کرنے کا
اشارہ کرتے ہوئے رخ پھیرا تو ایک دم مہران کو محسوس
ہوا جیسے اس کا دل بھی انہی تھیلیوں کے درمیان
پھنس کر رہ گیا ہے۔

ان میری اک من لے تو

ان میری اک من لے تو

فضا میں لہرا کر اٹھتے اس کے مرمرس بازو وہیں بلند
رہ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے دیکھنے لگی۔
اس کی نظروں کے تعاقب میں اکثر نے پیچھے گردنیں
گھمائیں تو خود کو سنبھالتا مہران یوں قدم بڑھانے لگا
جیسے وہ ابھی ابھی منظر میں داخل ہوا ہو۔ مشہور دھب
سے کارپٹ میں بیٹھ چکی تھی۔ گانا ابھی بھی چل رہا تھا
اور کئی لڑکیوں کی قل قل بھی شروع ہو چکی تھی۔
مہران نے مسامت سے پھولوں سے بھرے تھیلے مینا کی
طرف بڑھائے اور اسی سنجیدگی سے باہر نکل گیا۔

اگرچہ رسم رات دیر گئے تک جاری رہی مگر وہ
”قصدا“ ساڑھے بارہ بجے وہاں سے نکل آیا۔ پونے

فون اکیلے۔
 "پلیز ہم سے غلطی ہو گئی۔ آپ کسی کو بتائیے گا
 مت۔" چھوٹے ہی پہلی بات اس نے یہ کی۔ لہجہ
 انتہائی التجا آمیز تھا۔

"آپ نے فون کرنے کا کہا میں نے کر لیا حالانکہ
 یہ میرے لیے انتہائی مشکل مرحلہ تھا پھر بھی میں نے
 صرف اس لیے کیا تاکہ آپ اب تو اس غلطی کو معاف
 کر دیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں آپ کو بھٹکا ہوا
 نہیں رہا اور نہ ہی آپ کو بیک نیل کرتے ہوئے بیان
 کرنے پر مجبور کیا ہے۔ میں تو صرف اس سارے قصے
 کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ مینا مجھے کافی عرصے سے بات
 ہے۔ مجھے اپنے بھائی کا روجہ بھی پتہ ہے۔ اس بار
 میرا ہلکا پھلکا مذاق کا رشتہ بھی بنتا ہے اگرچہ اس قسم
 کے بے ہودہ مذاق کا نہیں پھر بھی۔ مگر آپ نے کیا
 سوچ کر مجھے اسے مذاق کا نشانہ بنایا ایک انجان آدمی
 تنگ کرنے کی غرض سے تو جی رات کو فون کرتے
 ہوئے آپ جھجکیں نہ سمجھائیں اور اب یہ ہے۔ ایک
 مشکل مرحلہ ہو گیا ہے یا نہ؟"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔
 آپ کو فون کرنے کے چہچہے نہ تو مینا کی شہادت ثابت
 ہے نہ ہی میرا کوئی مذاق کرنے کا راوی تھا۔ مگر دونوں
 نے آپ کو فون کسی غلط مقصد کے تحت نہیں کیا تھا۔
 اس وقت میری نیت کچھ اور تھی میرے دل میں کسی
 قسم کا غلط خیال نہ تھا۔ اس لیے آپ سے بات کر سکتے
 ہوئے جھجکی نہیں اور اب صرف آپ نے مجھے مجبور
 کرنے پر یہ قدم اٹھایا ہے تو ظاہر ہے غلطی تو نل ہو رہی
 ہے تب میں اکیلے نہیں تھی۔ میرے ساتھ مینا تھی
 رونا تھی پہلی اور قری بھی تھیں۔ ہم چھپ کر کوئی کام
 نہیں کر رہے تھے اور آج میں اپنے گھر والوں سے
 چھپ کر آپ کو فون کر رہی ہوں صرف اس ڈر سے کہ
 آپ ہماری بے ضروری حرکت کو غلط رنگ دے رہے
 ہیں اور کہیں اسی غلط انداز میں سب کے سامنے پیش
 نہ کر دیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن آپ کا اسٹائل

دھمکانے والا ہی تھا۔" سارہ سے لہجے میں اتنی سچائی
 تھی کہ مہران کو یقین کرتے ہی غی۔
 "مانا۔ لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کے
 اور مینا کے دماغ میں کیا سلایا تھا۔" اصل حقیقت تو وہ
 اب بھی جانتا چاہتا تھا۔

"اس روز شاپنگ کرتے ہوئے مینا نے آپ کی
 منگیتر کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ مختصر سی علالت کے
 بعد بڑی کم عمری میں وفات پا گئی اور یہ بھی کہ چھ ماہ
 گزرنے کے بعد بھی آپ خود کو اس صدمے سے
 نکال نہیں پا رہے۔ اس نے بتایا تھا کہ راحت بھی کبھی
 خاصی کو شش کر رہے ہیں آپ کو زندگی کی طرف
 دوبارہ لانے کی لیکن آپ ہیں کہ جوگ لیے بیٹھے
 ہیں۔" ناعسی صاف گوئی کے ساتھ اس نے بتایا۔

"اچھا تو جی ایسے ہوتے ہیں ویل ڈریسنگ کلین
 شیپر۔"

"اب مجھے کیا پتا مینا نے تو یہی بتایا تھا پھر آپ کا
 رویہ کیسی ایسا ہی تھا۔ دردناک لگانے سے جا رہے تھے۔
 دو تھوں کی محفل بار بار چھوڑ کر آپ تاریک گوشے
 تلاش پھرتے تھے۔ شستے بولتے تو آپ کو میں نے دیکھا
 ہی نہیں۔ اس لیے یقین کر لیا اور جی بڑا افسوس بھی
 ہوا۔ دیکھیں ناں جاسنے والے تو چلے جاتے ہیں بس
 یادیں رہ جاتی ہیں ان کو دل میں تو بسایا جاسکتا ہے مگر
 دل بھلایا تو نہیں جاسکتا۔" اس کی باتیں کھٹ سے
 مہران کے دل پہ لگی تھیں۔

"واقعی دل یادوں سے کب بھٹکا اور یادیں
 ہیں بھی کتنی؟" اس نے سوچا۔
 "یادوں کے سارے زندگی نہیں گزرتی۔" وہ بولتی
 رہی۔

"ماشا اللہ کس فلم کے ڈائلاگ ہیں۔" اس کے
 دل جلاو سینے والے ریمارک پر وہ چڑ گئی۔
 "کیا مطلب؟ آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرے
 خلوص کا۔ ہم سب نے تو شخص ہمدردی کی نیت سے
 بڑے خلوص کے ساتھ آپ کا غم ہلکا کرنا چاہا تھا۔ یہی
 سوچا تھا دو چار فون کالز کے ذریعے آپ کی برین واشنگ

کریں گے زندگی کی قدر کرنا سکھائیں گے اور زندگی سے محبت کرنا بھی۔

”ہاں محبت۔ محبت کرنا تو تم نے سکھا ہی دیا۔“

اس نے دل ہی دل میں سرگوشی کی۔

”بھائیے! اب تو آپ کو ایسے کیا کہ یہ کوئی اوجھا مذاق نہیں تھا۔“

”چلیں مان لیا لیکن آپ کیا سوچ کر مجھے

سدا حارسہ چلی تھیں۔ مینا کا ہونے سے کوئی تعلق نہ تھا

لیکن آپ شخص ہی نہ تو قلب لڑکی کی باتوں میں آکر

اتفاقاً قدم اٹھاتے تھیں۔ ایسا جان شخص پہ اعتبار کرنا

سراسر بے وقوفی ہے۔“

”لیکن میں نے بتایا تو اب کہ میرا مقصد۔“

میران نے اس کی بات غٹ کی۔

”ضروری نہیں کہ وہ جیسے فکر آ رہا ہے ویسا ہی ہو

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سر سے کسی کے بارے

میں جو اندازہ لگا کر آپ کو بتائیں وہ درست ہی ہو۔ مام

نور ایک بہت اچھی اور سچی باتیں باتی ہے۔ کوئی بھی

شخص اپنی بیوی کے رویہ میں دیکھنا پسند کرے گا۔

ہماری منگنی مکمل طور پر اسی طرح ہے۔ کوئی شخص اس شخص کا

چکر نہیں تھا اور نہ ہی مستقبل کے بعد کوئی یہاں سے چلا

جیسا کہ آپ سمجھ رہی ہوں گی۔ لیکن میں خوش تھا

منظم بن تھا اور مجھے ہوتا بھی چاہیے تھا۔ ماہ نور میں کوئی

کمی نہ تھی اور پھر وہ میرے پورے گھر اپنے کی مشیر کہ

پسند تھی۔ اس کی اچانک موت واقعی ایک سانحہ تھی

سب کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی۔ وہ ایسی لڑکی

تھی جسے کہ اگر وہ میری مشیر نہ ہوتی تب بھی یہ مادہ

میرے دل پہ اثر ڈالتا اور شاید چمٹانے آپ کو یہ نہیں

بتایا کہ وہ میری ایک نہ رہ پوری چار عدد بھائیوں کی

چھوٹی اور چستی بہن بھی تھی۔

ان چاروں کا جو وقت ماہ نور کو بھلائے نہیں دیتا۔

ہمارے پورے گھر پہ پچھلے کئی ماہ سے سوگواری چھائی

ہوتی ہے۔ میں میری امی جان اور ابی جان کھل کر

مسکرا بھی نہیں سکتے کہ کہیں ہماری بھابیوں کو یہ

محسوس نہ ہو کہ ان کا دکھ ہمارا دکھ نہیں ہے انہیں

اپنی ہسویں کی دل آزمائی منظور نہیں اور میں۔۔۔

جائیں میں کیسے ہنس سکتا ہوں بول سکتا ہوں۔“

”واقعی؟ عجیب سی بات ہے یہ تو۔ آج کل ایسا ہوتا

ہی کہاں ہے؟“ وہ میران کی فیملی کے خلوص سے متاثر

ہو گئی۔ ”ساس سسر اور ہسویں کے مزاج کا اس درجہ

احساس کریں؟ کتنا اچھا لگ رہا ہے سنے میں ہی۔ یقیناً“

آپ کے امی اور ابو بہت حساس دل کے مالک ہیں لیکن

انہیں اپنی ہسویں کا غم بانٹنا چاہیے نہ کہ انہیں ان کے

حال پہ چھوڑ دینا چاہیے اور آپ ایسے کیوں بنے پھر

رہے ہیں۔ کیوں خود کو مجرم مجرم سا محسوس کرتے ہیں

اپنی بھابیوں کے سامنے خود بھی مسکرائیں اور

انہیں بھی ان کی مسکراہٹ واپس لوٹائیں۔ اس میں

ڈرنے جھجکنے کی کیا بات۔“

وہ اس کے اتنے صحیح تجزیے پہ حیران ہو اٹھا۔ یہ

سب تو اس نے معطر کو بتایا بھی نہیں تھا۔ واقعی وہ کھل

کے جینا چاہتا بھی تو کسی نہ کسی بھائی کو سامنے دیکھ کے

چور سا بن جاتا۔ اسے لگتا جیسے وہ دل ہی دل میں گلہ کر

رہی ہوں کہ ”میران اتنی جلدی۔ اتنی جلدی تم

ہماری نور کو بھول گئے۔ اتنی جلدی۔“ اور اس کے

اب سکر جاتے دل مرجھا جاتا۔

”پچیس پچیس سال کے ساتھ کے بعد جب کسی

کی بیوی مرجاتی ہے تو میں نے اکثر کو چند ہی دنوں کے

بعد وہ سراپا رہ جاتے بھی دیکھا ہے اور کوئی انگلی تک

نہیں اٹھاتا۔ آپ نجانے کیسی طبیعت کے ہیں کہ

”وہ نجانے تعریف کر رہی تھی یا طنز۔“

”نہیں بس ایسا ہی ہوں مجھے ہمیشہ اگلے کی فکر زیادہ

ہوتی ہے۔ کوئی کیا سوچ رہا ہے کیا سوچے گا فلاں کو

کیسا لگے گا فلاں کیا محسوس کرے گا۔“

”نی الحال تو مجھے یہ فکر زیادہ ہو رہی ہے کیونکہ میری

فون کال خاصی لمبی ہو گئی ہے۔ ابھی کسی نہ کسی کام

سے کوئی مجھے ڈھونڈتا آئے گا اور پھر اس سوال کی ہو گا کہ

کسے فون کر رہی ہو۔“

”اور تمہارا جواب کیا ہو گا؟“ بڑے نامحسوس

طریقے سے وہ آپ سے تمہارے تمہارے

تھا۔

”اچھا مان لیا۔“ وہ غلٹ سے بولی۔

”میتا کے کان پکڑ کر اسے سرزنش کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں میں۔ اور آپسے کیا تم مجھے کوئی حق دو گی؟“ اس سے بات نہ نہ سکی۔

”کان پکڑنے کا؟“ حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور کھل گئیں۔

”نہیں بھئی۔ وہ دراصل۔۔۔“ وہ حقیقتاً پزل ہو گئی۔

”وہ اس دن تم نے کہا تھا کہ یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی لیکن تم یہ تو بتانا بھول ہی گئیں کہ زندگی پھر کس سہارے گزرتی ہے۔ کیا۔۔۔ کیا تم وہ سہارا ہونگی؟“ اس کے لب کی چھو تاپہ چلیں گرائے لہری موط نظر اٹھانے یہ مجبور ہو گئی۔ اس کی سیاہ بھنورا آنکھوں میں ایک گدگدانا سا تبسم سارے جواب لیے ہوئے تھا۔ مہران مطمئن سا ہو کے ایک طرف ہو گیا۔ پھر بعد میں اسے ایک کونے میں تھما پائے چپکے کہہ آیا۔

”میں نہ بھٹکی، اے رہا ہوں نہ اتنا رہا ہوں۔ میں صرف کہیں بتا رہا ہوں کہ کل رات دس بجے میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“

اور اس رات معطر کا فون آیا تو سہی مگر یہ وعدہ لینے کہ آئندہ کبھی وہ اسے فون کرنے کا نہیں کہے گا۔

”میں خود ہی کبھی کبھار تمہیں کال کر لیا کروں گی۔“

اس وقت جب گھر پہ کوئی نہیں ہو گا۔ کسی کی موجودگی میں وہی خطرہ ہو گا کہ اگر کسی نے پوچھ لیا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گی۔ مہران میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ میں خود برا اعتماد کرنے والے ہر شخص کا مان رکھوں گی۔ میرا ایک جھوٹا اس مان میں دراڑ ڈال دے گا۔ مجھے یقین ہے، تم کبھی ایسا نہیں چاہو گے۔“

اور اس نے بھی متاثر ہو کر وعدہ کر لیا تھا۔ بعد میں اسی میل کے ذریعے اور کبھی کبھی نیٹ چینک کے ذریعے وہ اپنی باتیں کر لیا کرتے۔

آج کافی عرصے بعد اس کی فرمائش پہ وہ اپنا چہرہ

دکھانے پہ رضامند ہوئی تھی۔ صرف یہی ایک طریقہ تھا جو معطر کے لیے کسی حد تک قابل قبول تھا۔ سخت ترین گرمی میں لمبا راستہ طے کرنے کے بجائے وہ کالج کے قریب ہی ماموں کے گھر چلی آئی اور طے شدہ پروگرام کے تحت مہران کو وہیں ہوتا تھا۔ اس کا ارادہ معطر کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد واپس لوٹنے کا تھا لیکن برا ہو اس پہ قرار ہی کا جو جھلک چھلک گئی۔ راحت نے اس کا بھید پالیا اور اب وہ اسے یونہی چھوڑ سکتا تھا بھلا۔



راحت نے اس سے سب کچھ اگلا کے ہی دم لیا۔ (یہ الگ بات کہ جسے وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا وہ کچھ بھی نہ تھا، مہران نے جہاں تک ہو سکا داستان خاصی سن کر کے سنائی کہ بہر حال وہ معطر کا بھائی تھا، ماموں زاد ہی سہی۔ اس سے وہ اپنی واردات قلبی کی تمام تفصیل بے تکلفی سے تو کہہ سکتا تھا۔)

”تو یہ چکر ہے۔“ اس نے کشن اسٹیرنگ کی شرح گول گول گھماتے ہوئے کہا تو مہران کو سخت برا لگا۔

”ایک تو یہ لفظ ”چکر“ مجھے سخت معیوب لگتا ہے اچھا بھلا شریفانہ سا تعلق مشکوک ہو سکے رہ جاتا ہے۔“

”جو چیز چھپائی جائے اس میں کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہوتا ہے۔“ وہ اپنی بات پہ قائم تھا۔ ”تم مجھ سے اتنی پرانی دوستی کے دعوے دار ہو اور اتنی اہم بات مجھ سے چھپا کر رکھی۔“ مہران کے حسب توقع وہ گلہ کر ہی بیٹھا۔ اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

”یار! تو میرا دوست سہی لیکن آخر تیرے گھر کی بات تھی۔ تیری کزن ہے وہ۔“ (اس نے جان بوجھ کر لفظ ”کزن“ استعمال کیا۔ خدشہ تھا کہ بہن کا لفظ اس کی غیرت کو جگانے دے۔) پھر تھا تم پرانہ مان جاؤ۔“

”ہاں۔ وہ میری کزن ہے اور تم میرے دوست ہو۔ میں اسے بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہیں بھی۔ برا لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برا تب لگتا جب میں

ماحول خاصا دوستانہ رہا ہے اور پھر وہ انکو قیامی بی بی ہے اس کی پسند وہ مسترد کر ہی نہیں سکتے اور ایسی صورت میں جب اس کی پسند حیرنے جیسا بندہ ہو۔ تیری سب سے بڑی سفارش تو تو خود ہے اور دوسری سفارش میں ہوں۔ پھر فکر کا ہے کی۔

”اور میرے گھر والے؟ ان سے نمٹنا کیا کم مشکل ہے۔“ اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے میں رنڈوا ہو گیا ہوں لیکن نہیں لوگ رنڈوؤں کو بھی عقد ثانی کا مشورہ دینے میں دیر نہیں لگاتے۔ میرے لیے تو لگتا ہے دنیا ہی ختم ہو گئی ہے۔ ابھی صرف ای جی سے بات کی وہ تو سستے ہی ایسے گھبرا میں جیسے خدا نخواستہ میں کوئی جرم کر بیٹھا ہوں۔ شادی کے بارے میں سوچ کر۔ الی جان سے بات کرنے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا ان کی ہچکچاہٹ پہ میں کٹنگ سا گیا ہوں کہ ہونے ہو کوئی گزربز ضرور ہے۔ مجھے تو نورنگ رہا ہے، کیس خدا نخواستہ الی جان مجھے ماہ نور کے نام پہ عمر بھر کنوارا بٹھائے رکھنے کا ارادہ تو نہیں کر بیٹھیں۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے سنے پہ ایک بار پھر خالہ جان سے بات کر کے دیکھ۔ تھوڑی ڈانسیلاگ بازی اور ایکٹنگ سے کام لے یا۔ ماؤں کو بلک میل کرنا تو بہت آسان ہے۔“

”کو شش کرتا ہوں لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میری خاطر الی جان سے لکر لے سکیں اور رہے الی جان تو نجانے ان کے دل میں کیا ہے۔“ مہران نے ایک بار پھر امی جان کا سہارا لینے کا ارادہ کیا۔



”اب بات شروع تو کریں۔“ وہ ایک بار پھر شفیقہ خاتون کے سر پہ سوار تھا۔

”کیسے کروں۔ کیا فائدہ؟ وہ ہر گز نہیں مانیں جس۔“

”کیوں نہیں مانیں گے۔ کیا ساری عمر مجھے کنوارا رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس سے تو اچھا تھا مجھے ماہ نور کے ساتھ ہی ”ستی“ کر دیتے۔“

تھمارے بارے میں غیر مطمئن ہو تاکہ تم وقت گزاری کرتے والے بندے تو ہو نہیں جو میں سچ پاہوتا اور جہاں تک معطر کی بات ہے تو اس پر میں تم سے بھی کہیں بڑھ کے اعتبار کرتا ہوں۔ وہ کوئی غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ تو۔۔۔ نیور۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کی حتمی تصدیق کے بعد مہران کے دل سے بوجھ سرکا۔ وہ سبک بہا ہو گیا۔

”مجھے حیرت صرف اس بات پر ہو رہی ہے کہ ہم لوگوں کے اندازے کس قدر غلط تھے۔ ہم سب یار تو مجھے بیٹھے تھے کہ تو اپنی منگیتر کے عشق میں گودے گنوں سمیت غرق ہو چکا ہے۔ کیا ماہ نور کا خیال معطر سے ملنے کے بعد دل سے اٹھا ہے یا پسے ہی خیالات بدلنے شروع ہو گئے تھے۔“

”ماہ نور سے مجھے محبت نہیں تھی راحت اور صرف کم عمری کی محبت کا پسنا آسان تھی۔ محبت کا احساس ہونے میں اور واقعی محبت کیسے نہ خاصا فرق ہوتا ہے۔“

”محبت کا یہ فلسفہ میری تکیہ سے تو باہر ہے۔ مجھے تو سیدھی ساری باتیں آسمان ہوتی ہیں۔ جیسے کہ ایک دوسرے کو پسند کیا یا نہ کیا۔ تب بات بچوانی شادی کی اور اور اللہ اللہ خیر سلا۔ مہران تو تو مجھ محبت کے فلسفے رٹا چھوڑ اور اسی لائن پہ آجائے۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں یا راتر مجھے یہ نیپار اتنی نظر نہیں آ رہی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اسی ڈپریشن میں یہاں تک چلا آیا۔ خود کو بہت تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا۔ پتا چلا کہ معطر آج تمہاری طرف آنے والا ہے تو سوچا کہ۔۔۔ ورنہ یقین کرو ایسے سستے اور اوتھے طریقوں سے ملاقاتیں کرنا نہ اسے پسند ہے نہ مجھے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی اور اس کی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے تھوڑی بہت غلط بیانی کے ساتھ کہا۔

”اوچھوڑ یار! میں کیا جانتا نہیں۔ مجھے یقین ہے اپنے یار پہ۔ اور یہ تو نے کیا کہا کہ نیپار نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک مٹھو کا تعلق ہے تو پھوپھی جی کے گھر کا

”جاؤ جا کر کہہ دو اس سے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہ عشق کا بخار اتر جانا چاہیے ورنہ علاج کے لیے مجھے خود کچھ کرنا پڑے گا اور وہ آپھی طرح جانتا ہے میرا طریقہ علاج کیا ہے۔“ انہوں نے الساری کے پیچھے کئی سالوں سے سنبھل کے رکھی بید کی چھتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شفیقہ خاتون کا دل ایک بار پھر بے ایمان ہو گیا ان کی ہمدردیاں دوبارہ بیٹے کی جانب منتقل ہو گئیں۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ خواجہ جی! جوان بیٹے کے ساتھ کیا ایسے پیش کیا جاتا ہے کیا انوکھا کام کر لیا ہے اس نے کون سا جرم کر بیٹھا ہے اچھے گھر لانے کی ایک سہمی ہوئی شریف بچی ہے اس کے رشتے کے لیے ہمیں بھیجنا ہی تو چاہتا ہے اس میں بری بات کون سی ہے۔“

”جب وہ جانتا ہے میں اپنی ہوس میں سالوں پہلے منتخب کر چکا ہوں تو اسے اوہراوہر نظر بھٹکانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ویدہ دلیری تو دیکھو منہ پھاڑ کے اپنے رشتے کے لیے فرمائش بھی کرائی جا رہی ہے۔ ایسا جبر تو نہیں ہو گا اس گھر میں باہر سے کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔ یہ میرا برسوں پرانا فیصلہ ہے۔ آج کل کس گھرانے میں اس خوش اسلوبی سے چار چار بھائیوں کے گنبے اکٹھے رہ رہے ہیں۔ اُسے والی پانچویں ہوا اگر ان چاروں میں سے نہیں ہوگی تو۔ تو بنا بنایا گھر ڈالوا ڈول بھی ہو سکتا ہے بیگم! یہ بات اسے سمجھا دو۔ اس گھر کو گھر بنائے رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے اسے اپنی ضد چھوڑنی ہوگی۔“

”آپ کی ہر بات درست، لیکن تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے سب ویسا تو نہیں ہوتا جیسا ہم سوچیں۔“ بیٹے کا پر بھایا تازہ بہ تازہ سبق دہرایا گیا۔ ”اب اگر ماہ نور نہیں رہی تو کیا مہران کو اپنا گھر بنانے کا کوئی حق نہیں ہے کیا؟ جب جیتا جاتا انسان پل بھر میں ختم ہو سکتا ہے تو خوابوں کی بساط ہی کیا ہے۔“

”واہ بیگم۔۔۔“ انہوں نے تو صیغی انداز میں کہا۔ ”ساری عمر یہ حسرت رہی تھی کہ کبھی آپ کے منہ

”کیا کر دیتے؟“ وہ ڈانڈ سمجھیں۔
”کیا راز؟ وہ چلایا پھر امی کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کے تاثرات دیکھ کر وہ ہمارا۔ شرمندگی بھی ہوئی کہ کس کا قصہ کہاں نکال رہا ہے۔“

”سوری امی! اور اصل میں۔۔۔ آپ سمجھیں پلیز۔۔۔ امی سے بات کرنے میں آخر کیا مشق آتی ہے۔ کہہ ازلم ان کے من کی بات تو باہر آتی ہے۔ چاہے کہ آخر وہ چاہتا ہے۔“

”اویچھ جی! تم کہتے ہو۔۔۔ میں نے ان کا یہی خواب دیکھا تھا۔۔۔ اتنے سے اتنے سے تب سے انہوں نے اس خواب کی جانب توجہ دینی ہے ایک طرح سے۔۔۔ میں نے سوچا کہ یہ سچ ہوا ہے ات

ایک مہینہ پہلے۔۔۔“
”ایسا حسن تو اب ہی غصہ نہ دینی چاہیے“ امی امی نے

”بہن! فوراً۔۔۔“ اس نے اٹھ کر جھپٹ لیا۔
”کوئی انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ امی! جانی کو سب بچھڑانے کے سبب منشا تو نہیں مل سکتا۔ ان کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ خیریتوں کے ساتھ سے چھوٹ چکی ہیں۔ پتہ آگیا ہے کہ ان کے خیریتوں میں لے لے لے لے۔۔۔ وہ گھر پرانا فیصلہ نہیں بدلتی ہیں آٹا بھی اس کا بڑا شوت ہے۔“

اس نے امی والی بات کرنے کے لیے راضی نہ رہی لیا۔ لیکن ان کے خدشے بھی بے بنیاد نہ تھے۔ شفیقہ خاتون خود کو یہ طریقہ لی، تمام خیریت کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کے باوجود کار کا رہ گئی۔

”کیا جو اس ہے یہ؟“ ان کی ہمت بھی کیسے ہوئی کسی اور جگہ سوچنے لگی۔ یہ وہ جانتا نہیں میں اپنی اولاد کے بارے میں کیا فیصلہ کر چکا ہوں۔۔۔“ اور امید تو مجھے تم سے بھی نہیں تھی شفیقہ خاتون کہ تم سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی اس کا مقدمہ میرے سامنے پیش کرنے چلی آؤ گی۔ کیا تمہاری نظر میں بھی میرے خوابوں کی کوئی وقعت نہیں ہے؟“ ان کے کڑک دار لہجے میں رفتہ رفتہ گھٹتا لہلہ انہیں پشیمان کر گیا اور وہ خود کو غلط نہ مانتے ہوئے بھی سرزنش کرنے لگیں۔

سے بھی چار باتیں سیانی سن لیں لیکن بجلی کے روز بروز بڑھتے نرخوں، گلاب کے سونوں کے کچے رنگوں، مسالوں کے گھٹیا معیار اور ملازمین کی آئے دن کی چھٹی کے دکھڑے رونے کے سوا آپ سے کبھی کچھ نہ سنا۔ ماشاء اللہ آج تو بڑی مدبرانہ گفتگو ہو رہی ہے۔ ”تحسین کے جھنڈے مارتے مارتے اچانک انہوں نے پینتڑا بدل دیا لیکن عقل مندی کی باتیں کرنے میں اور واقعی عقل مند ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ اس طنز انداز پر وہ نکل ہو کے رہ گئیں۔ واقعی یہ بڑی دلیلیں وہ کیسے دے سکتی تحسین جلد بس جو مہران سے سنا دہرایا۔

”خواب بھی نہیں میرے انسان مر جاتے ہیں۔ میرا خواب ماہ نور نہیں بھی وہ نہیں رہی مر میرا خواب سامت ہے۔ اس خواب میں آخری رات اب ماہ گل بھرے گی۔“

شفیقہ خاتون پچھلی پچھلی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ شوہر کی میزان آتش و ہونے کی وجہ سے یہ موبوم سا اندیشہ ان کو کئی دنوں سے ہوتا رہا تھا۔ خواجه صاحب کی اطمینان بھری خاموشی اسی طرف اشارہ کر رہی تھی لیکن پھر فوری وہ ایسا اس خوں کو جھٹکا دیتی تھیں۔ ”نہیں نہیں خواجه صاحب لالہ صدی نور جذباتی ہوں پھر بھی ایسا نامعقول نہیں ان سب باتوں میں نہیں آسکتا۔“ ان سے ہر طرح کی بات عقلیت کی امید رکھنے کے بارے میں وہ خوش نہ تھیں۔ جانتی تھیں اب وہ ٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے خواجه خلیق نے ان کی ساری خوش گمانیوں کی ایسی کی ایسی کر کے رکھ دی تھی۔

”یہ یہ زیادتی ہے۔“ کمزور آواز میں انہوں نے احتجاج کرنا چاہا جسے خواجه صاحب نے فوراً ہی دبا دیا۔ ”کیسی زیادتی؟ کیا غلط سوچ لیا میں نے۔ اپنے گھر کو گھر بنائے رکھنے کی خواہش رکھنا غلط کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنی اولاد کو پیار محبت سے اکٹھے ہنستا ہوتا کھنا زیادتی کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو خدا کا کرم ہے“ اس نے مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالا اور نہ سوچو ماہ نور کے بعد اگر ماہ گل کا وجود نہ ہوتا تو میں کس قدر مشکل میں پڑ

جاتا۔“

”کاش ایسا ہی ہوتا۔“ شفیقہ خاتون نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”ماہ گل کے لیے ایسا سوچنے سے قبل آپ اسے غور سے دیکھ تو لیتے۔ بمشکل تیرے چودہ سال کی ہوگی۔ برائے نامیں لیکن آپ کی اپنی بڑی پوتی ندا تقریباً اس کی ہم عمر ہی ہے جسے آپ ابھی تک کاغذ سے پہ اٹھائے پھرتے ہیں، اگر کل کو کوئی اس کے رشتے کے لیے آپ سے بات کرنے آجائے تو؟ اور وہ بھی کسی ایسے لڑکے کے لیے جو اس سے عمر میں دو گنا بڑا ہو تو آپ کو کیسا لگے گا؟“ ان کا گستاخانہ انداز خواجہ جی کو سخت ناگوار گزرا۔

”تم آج بہت بڑھ چڑھ کے بول رہی ہو شفیقہ۔“ ان کے پاس آخری حربہ بس یہی تھا کہ وہ ڈانٹ کر انہیں چپ کرادیں اور ایسا ہی ہوا، شفیقہ خاتون سسم سی گئیں لیکن بدد آکر اتنا کہنے سے خود کو روک نہ پا گئیں۔ ”آپ سمجھ تو چپ کرادیں گے مگر آپ کے اس فیصلے پر اور کون سے اعتراض نہ ہو گا۔ اتنا بے جوڑ سارے رشتے پر اور بے جا تحسین۔ پھر مہران۔ وہ تو ماہ گل کو اس پیشیت سے ہرگز قبول نہیں کرے گا خاص طور پر اب جب کہ وہ کسی اور کو بیچیدگی سے پسند کرنے لگا ہے۔“

”اسے اپنی پسند بد لینی ہوگی اور باقی سب کو بھی اپنے اپنے اعتبار سے پس پشت رکھنے ہوں گے۔ اس گھر کی بقا کے لیے یہ اقدام اب اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔“ ظاہری سی بات ہے اگر آخری ہو یا ہر سے لاؤں گا تو وہ خود کو اوپر اوپر محسوس کرے گی۔ یہ چاروں سگی ایک طرف ہوں گی اور وہ انگ۔ گھر میں دو محاذ کھلے ہوں گے۔ میں مہران کی بہتری کے لیے یہ فیصلہ کر رہا ہوں۔ اسے اپنی زندگی میں سکون اور امن چاہیے تو میری بات مان لے۔“



مہران کے لیے تو اپنی جی کا یہ نیا حکم جاہ کن تھا ہی باقی سب کے لیے بھی کم غیر متوقع نہ تھا۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ حیران تھے، آخر اپنی جان کو یہ سوچ بھی کیسے۔ خواجه

کیلکولیٹر اور ریسیدجک منجانب سے کسی حساب کتاب میں مصروف تھے۔ اس نے مذا کو ہانے سے چائے پلانے بھیجا اور اپنا دیکھنا روکنے لگا۔

”جیسا بھی! آپ ہی جانیے۔ انی جان کی ضد جائز ہے یا ناجائز۔ میں فقط کو پسند کرتا ہوں لیکن اگر ایسا کچھ نہ بھی ہو تو ان کا فیصلہ میرے لیے ناقابل قبول تب بھی تھا۔ کوئی تک بھی تو ہو کسی بات کی۔“

بھابھی کو کہنے جانی رہی تھیں کہ پہلے بھیا نے قسم بات سے رکھ کر بیان دیا۔

”اس بات سے انہیں یا مزید یا ناجائز کیا نا جائز کس کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اس نے ساتھ نا انصافی۔ بس ان کا برس پرانا خواب پورا ہونا چاہیے۔ ان کے پانچوں بیٹے ایک سے لے کر چار بجے چائیں۔ اب وہ بیٹے رہنے ہیں۔“

خیر میں نے کہا کہ اس سے انہیں کیا فائدہ۔ ”اس کی مرضی کے مطابق ان کے بیٹوں کی زبانیں کھلی گئیں ہیں اور حسب امید خالص سوسائٹی میں چلوان تو ہو میں تو میں اپنے دل سے کہتا ہوں وہ بیویاں من چاہی ہیں یا نہ ہیں۔“

”ہو نہ ہو مرضی۔“ انہوں نے استہزاء سے ہنکارا بھرا۔ ”یہ تمہارے سامنے تو کھڑا ہے ”مرضی“

والا کتنی سنی جا رہی ہے اس بیچارے کی؟ اور وہ تو وقت ہی اور تھا۔ اس زمانے میں تو ابلی جان کے ”نیکے“ ہی اور تھے دم مارنے کا حوصلہ نہ تھا۔ بس۔۔۔ برے

پھنسے۔“

”بس کیا کیجیے“ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ جی کو ایک نظر دیکھ لیجیے۔ شاید ہوش آجائے۔ ہر وقت یہی ذکر۔ یہی رونے۔۔۔ من من کر تنگ آگئی ہوں میں تو۔“ بھابھی نے ہاتھ میں پکڑی کاپیاں نیچے پٹخیں اور سخت عاجز آکر کہا۔

”صرف من من کر ہی؟ میری ہمت کی راہ دو دیکھ دیکھ کر تنگ آگیا ہوں بے روٹی۔۔۔ بد رنگی۔ اور بد مزاجی بھی۔“ انہوں نے چھوٹے بھائی کی مودتوں کا لانا بھی نہ کیا اور انتہائی خراب الفاظ میں اپنی بے زاری ظاہر کی جسے من کر بھابھی کے چہرے کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا۔ اتنی تذلیل وہ برداشت نہ کر سکیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ مہران خود بھی رنگ تھوڑوں کے حالات دیکھ کے۔

بھیا کی بھابھی سے بے زاری اور گریز زول سے سب پہ حیاں تھا۔ یہ کوئی دھکی چھپی بات تو نہیں تھی لیکن اس طرح بھیا کو کھیل کر بولتے دیکھ کر وہ حیران تھا۔ (یہ تو ان کی عادت نہ تھی) اور کچھ کھٹک سا گیا۔

”جینے بھیا! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں اور سمجھ دار بھی ہر بات کا اثر لیتے ہیں۔ ہر وقت کی نوک جھونک مناسب نہیں۔“ اس نے بھیا کی اچھی خاصی بد زبانی کو مروت میں نوک جھونک کا نام دیا۔ ”عمر کے اس دور میں آکر بروہاری۔“

”کیسی عمر کتنی عمر؟ اور میری عمر اس کی عمر؟“ بھیا ہنرک ہی تو تھے۔ ”میرا خیال تھا کہ تم یہ یہ وقت آن بڑا ہے اس لیے کم از کم تم تو میرا دکھ جان پاؤ گے لیکن نہیں۔۔۔ سب کی نظر میں بس اپنا مسئلہ ہی اہم ہوتا ہے۔ دوسروں کے لیے بڑی آسانی سے صبر اور برداشت کے مشورے دے دیے جاتے ہیں۔“

”میں اسٹینڈ لے چکا ہوں اور جو دور آپ گزار رہے ہیں۔ اس سے بچنے کی خاطر ہی یہ سب کر رہا ہوں۔ میری نظر میں یہ اہم نہیں کہ میرا من پسند سا بھی مجھے ملے۔ یہ بات زیادہ اہم ہے کہ کوئی اور ہستی میری

پابندی کی بجائے نہ چڑھے۔ اگر آپ میں ہمت نہیں تھی اپنی منوائے کی تو اس میں بھابھی بچاوی کا کیا قصور۔ وہ خود تو زبردستی آپ کے سر پہ نہیں چڑھیں۔ اپنی بڑی اور کم ہمتی کی بھڑاس ان پہ نکالنے کا کیا فائدہ؟

”بھڑاس میں نہیں رہا ہوں یا تم؟ تیرے تک نہیں تمہیں بڑے بھائی سے بات کرنے کی اپنی اوقات میں رہو۔ یہ باتیں سن کر میں اپنی جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ میں اپنی صورت دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ تو میری جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔ اور وہ میری جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔

”یہ باتیں سن کر میں اپنی جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔ اور وہ میری جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ میں اپنی صورت دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ تو میری جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔ اور وہ میری جگہ کی رکالت کرتا ہوں۔

”رضی نے بتایا نہیں ہے؟“ وہ روٹھنا روٹھنا سا بولا۔

”اور رضی نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے تمہاری پسند کی مسالہ بھری جھنڈی لٹا لی ہے اور قیمہ میں شملہ مرچ بھی تمہارے لیے ہی ڈالی ہے ورنہ اور سب تو آکو قیمہ ہی شوق سے کھاتے ہیں۔ چلو اٹھو۔ شایاں۔ باہر آؤ۔ میں گرم گرم روٹی ڈالوں۔“ وہ بازو کھینچ کر اسے اٹھنے پر آمادہ کرنے لگیں لیکن وہ بس سے مس نہ ہوا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے بالکل بھی نہیں ہے۔“ وہ ناز نے رتی برابر یقین نہ کیا۔ اس نے ناشتے پہ بھی خالی چائے کا کپ ہی لیا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ ان کا یہ

اکلو تا پور بھوک کا کس قدر کچا ہے اور خصوصاً ”چھٹی والے دن تو ناشتہ کرتے ہی دوسرے کھانے کے لیے واویلا شروع کر دیتا، لیکن میں کھس کھس کر فرمائشیں کی جاتیں۔“

”چلو چلو، نخرے چھوڑو، کھانے سے کیا ناراضی بلکہ ہم سب سے بھی کیا ناراضی، شکایت تو صرف الی سے ہے پھر یوں گھر بھر سے منہ سجا سجا کر پھرنے کا کیا مطلب؟“

”مجھے سب سے شکایت ہے۔ کون ہے جو میرا ساتھ دے رہا ہے؟ امی ہیں تو بارہا ان کے بیٹھ گئی ہیں۔ بڑے بھیا کے پاس گیا تو بجائے میری مدد کرنے کے اس نے مجھے حساب کھول کے بیٹھ گئے الی جان سے الٹا بھائی کی شامت آگئی، میرا سسلہ وہیں کا وہیں رہا اور دونوں کا جھگڑا شروع۔ عمران اور لقمان بھیا سے اسے لڑنا چاہا تو دونوں نے حسب عادت لا تعلقی اختیار کر لی، ان دونوں کا تو خیر ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔ لڑنے کے ہر معاملے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ بس اپنا آفس اپنا کارنامہ اپنی بیوی اپنے بچے۔ اور بھابھیاں۔ ان کی بات تو نرالی ہے، جانتی ہیں اس وقت انہیں کیا غم لاحق ہے کہ الی جان نے انہیں میٹنگ میں شریک کیوں نہیں کیا اور ان کا موقف ہے کہ جب کسی بات میں ان کی رائے طلب کی ہی نہیں جاتی تو پھر وہ دخل بھی کیوں دیں۔ ہر طرف سے صاف انکار سننے کے بعد کیا اب بھی مجھے ناراض ہونے کا حق نہیں۔“

”ہر طرف سے؟ ہر طرف سے تو انکار نہیں ہوا۔ تم نے مجھ سے بات کی؟ اپنے چھوٹے بھیا سے ذکر کیا؟“

”آپ سے؟ مگر آپ کیا کرتیں۔ آپ تو خود الی جان کی۔“ وہ ”جی جی ہیں“ کہتے کہتے رک گیا۔ ”جب اسی جان اور بڑی بھابھی نے معذوری ظاہر کر دی تو آپ بھلا کیا تیرا مار لیتیں۔“

”اور کچھ نہیں تو تمہیں تسلی دے دیتی، امید رکھا دیتی۔“

”اوہ۔۔۔ تسلی۔۔۔ امید۔۔۔ ہاں بھی خزانے

دیر بعد آنے والا معطر کا فون مزید مددگار ثابت ہوا۔
لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے لیے میں مخصوص
بشاشت پیدا نہ کر سکا جسے معطر نے فوراً محسوس کر
لیا۔

”کیا بات ہے؟ آپ کچھ بچھے بچھے لگ رہے
ہیں۔“

”خیر یوں تو مت کہو۔ مکمل بچھا تو نہیں ہوں بس ذرا
شمٹا رہا ہوں۔“

”خیریت؟ یہ کس نے مزاج شریف کے شعلے
پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کی ہے؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”میرے الی جان نے اور کس میں اتنا دم ہے؟“ وہ
سنجیدہ ہوا تو معطر بھی چپ کر گئی اس کے والد کا ذکر سن
کر۔

”کیسے یہ سب میری وجہ سے تو نہیں مہران؟“ وہ
فکر مند ہو گئی تو اسے لب کھولنے ہی پڑے۔

”او کم آن مٹھو۔“ لاڈ میں آکر وہ اسے اسی نام سے
پکارتا۔ ”میرے اور الی جان کے درمیان یہ سب چلتا

ہی رہتا ہے۔ اب کوئی نہ کوئی تو گھر میں ایسا ہونا چاہیے
جو آمریت سے ٹکر لے ورنہ حکمرانوں کی عادتیں مزید

خراب ہو سکتی ہیں۔“ اس نے لائٹ سے انداز میں کہا
لیکن معطر کی حساس طبیعت اور بے چین ہواٹھی۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ اپنے والد کے
بارے میں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ کوئی زیادہ بد تمیزی تو

نہیں کی ان سے۔“
”نہیں یا۔۔۔“

”مجھے یار مت پکاریں۔“ اس نے ناگواری سے
ٹوکا۔ ”ہاں اب آگے بتائیے۔“

”محترمہ۔ بلکہ عزت مآب محترمہ معطر ہوں
صاحب! ناچیز نے اپنے والد بزرگوار سے کسی قسم کی کوئی

گستاخی نہیں کی۔ بندہ صرف اقبال جرم کر بیٹھا ہے
یعنی آپ کو پسند کرنے کا اظہار کیا ہے اور بس۔ ظاہر

سی بات ہے جس گھر میں اولاد کا چوں کر نا بھی ناممکن ہو
وہاں اگر کوئی سپوت باقاعدہ چاں چاں کرنے لگ جائے

تو ایک دم جھٹکا تو لگتا ہے ناں برسر اقدار شخصیت کو۔“

بھرے پڑے ہیں آپ کے پاس قسیلوں کے امیدوں
کے بھی انبار لگے ہیں۔ لیکن صرف زبانی کلامی امداد
سے کچھ بننے والا نہیں۔ بات تو جب ہے کہ عملی طور پر
کوئی قدم اٹھائے اگر آپ الی جان کو ان کا فیصلہ
تبدیل کرنے پر مجبور کر سکیں تو نہیں۔“ اس نے چیلنج

دیا۔ ظاہر ہے مہ ناز بھابھی سے زیادہ الی جان کی
تاجدار اور جی حضوری کرنے والا اور کون تھا۔

”کیا فیصلہ“ فیصلہ لگا رکھا ہے۔ کون سا فیصلہ میرے
منے بھیا؟ جتنا فیصلہ بھی کبھی ایک طرفہ ہوتا ہے؟“ وہ

پر اسرار طریقے سے مسکراتے ہوئے بولیں۔
”کیا مطلب؟ ارے اتنے سالوں میں آپ جان

نہیں پاتیں۔ یہاں تمام فیصلے یکطرفہ ہوتے ہیں۔ اولاد
کو پر اپنی سمجھ کر بڑی آسانی سے تمام معاملات

نمٹائے جاتے ہیں۔“
”ہاں مہرا بی اولاد کے۔ کسی کی اولاد؟ کیا زور؟“

”نہیں۔ یعنی۔ کیا مہنا چاہ رہی ہیں۔ آپ؟“ وہ
چونکا۔

”صاف اور سیدھی بات ہے۔ الی جان کا فیصلہ
ہے لیکن اسے منظور نہ تو میرے لیا جی میں سگ۔ تم

بات آگے بڑھنے تو دیکھیں۔ نکل دینو اور تیل کی
دھار۔“ مہ ناز کی بادامی آنکھوں میں شرارت تیر رہی

تھی۔
”یعنی آپ دو بدو آنے کے بجائے پس پر وہ رو کر

میری مدد کریں گی۔“ وہ پر جوش ہو کر اٹھ بیٹھا۔
”ہاں لیکن اگر ضرورت پڑی تو۔۔۔ ورنہ مجھے امید

ہے کہ لیا جی خود ہی سمجھ داری کا ثبوت دیں گے۔
در اصل بہت سی باتیں ہیں جنہیں الی جان اپنی

جذباتیت میں نظر انداز کر رہے ہیں یہ سب میرے اور
تمہارے بجائے لیا جی انہیں بہتر طور پر سمجھا پائیں

گے۔“
اس گفتگو کے بعد وہ وقتی طور پر مطمئن ہو گیا۔ اس نے

سوچ لیا کہ شیخ نواز حسین سے الی جان کی بات ہونے
سے پہلے اتنا پریشان ہونا قبل از وقت ہے۔

اس کی طبیعت پہ چھایا تلک درود کرنے میں کچھ ہی

اس کے انداز میں ہنوز لارڈ وائی تھی۔ درحقیقت وہ دانستہ اس معاملے کی شگینی ظاہر کرنا چاہ رہا تھا۔
 ”کیا واقعی بات سیریس ہو گئی ہے؟“ مہران کو اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ اس کے چہرے پہ ہولناکیاں اڑ رہی ہوں گی۔

”نہیں بھئی“ ایسی خاص پریشانی والی بات نہیں۔ دراصل تم تو بواپے چیرٹس کی اکلوتی اکلوتی صاحبزادی۔ تم نے یہ بھرے پٹے کنوئیں والے مسائل کہاں دیکھے ہوں گے۔“ ”سچ کیا پکے گا؟“ یہ روزمرہ کے مسئلہ پہ انہی ہمارے کہہ تیں اس میں آرا پیش ہوئی ہیں اور یہ بات بھی خاص الیہیں ہے۔ جتنے لوگ ہیں اتنے ہی مشورے۔ خبرست چارہ میری بھابیوں جیسے انی جان کی پسند آئے۔ رائی بات تو غیر ہیں ہی سب سے زیادہ نکتہ نہیں۔“

”نہیں مہران“ مجھے ڈر لگتا ہے۔ سب سے پہلی بات کو شش مت سمجھو جس کے نتیجے میں اس کا آپ سے خفا ہو جائیں۔ جو آپ سے ہرگز نہیں مجبوری کی حالت میں مجھے قبول کرنا پڑے گا۔ میں بھلا میرے لیے کتنی گنجائش ہو سکتی ہے۔ تو کمزور اور بوی ہی رہے گی۔ مجھے نہ سناؤ گے۔ محبت نبھانے کیا کیا برداشت کرنا پڑے۔“ اگر کے آنسو جھلک پڑے۔

”بس یہی تو ساری بات ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”تم میری فیملی کو اچھی طرح جانتی ہونے ہی وہ تمہیں اپنے طور پہ اندازے لگانا کرنا امید ہو رہی ہو مجھے اپنی پسند پہ غور ہے کہ تمہیں کوئی رہنمائی نہیں ملتا اسی طرح اپنے گھر والوں پر بھی یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کر ہی نہیں سکتے۔ ارے میرے اہی جان تو باقاعدہ سر پہ چڑھاتے ہیں، ہووے کو۔“

”کوئی کھٹ پٹ“ لڑائی جھگڑا۔ کچھ نہیں ہوتا کبھی۔“ وہ متحسّس تھی، جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہنے والے لیے جوڑے خاندانوں کے درمیان جاری فسادات اکثر سنتی رہتی تھی۔

”اول یہاں ہوتے تو ہیں۔“ کچھ سوچ کر اس نے ایمانداری سے جواب دیا۔ ”بلکہ شاید ہر روز ہوتے ہیں لیکن ویسے ہی جیسے بہت سارے بسن بھائی اکٹھے رہتے ہوں تو گری سرور ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن بھائیوں میں یہ سب چلتا رہتا ہے۔ ہم روکتے ہیں جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے پریشان نہیں ہوتے ہیں، سب چلتا ہے۔“

”ہاں یہی تو زندگی کا حسن ہے۔ گلے شکوے کہاں نہیں ہوتے۔ بس انہیں انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے اور آپ کی بھابیوں۔ کیا وہ بھی اتنی ہی فراخ دل ہیں۔“

”وہی ہی ہیں جیسے ہم بھائی ہیں فراخ دل ہیں یا غلبہ دل اس کا سمجھتا نہیں۔ ایک ہماری بڑی بھابی ہیں مہ لقا صاحب۔ تم نے لقا کو تری کا سن رکھا ہو گا۔ بس وہی کلفٹن کی گردن میں بھی ہے اور یہی اکثر ہے۔ انہیں نقصان پہنچا رہی ہے ورنہ وہ ایک آئیڈیل قسم کی بھابی ہیں۔ بسن اور بھابی ہیں بس بیوی اچھی نہیں رہتا۔ بسن اپنے شاہ پرستی نظر میں۔ عمر کا فرق اتنا زیادہ بھی نہیں اور اتنی زیادہ تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں کسی عورت کے لیے کہ وہ اپنی عمر میں سے چند سال حذف کر کے اور زیادہ کم عمر دکھائی دے۔ لیکن اس میں شاید ان کی انا تڑپے۔“ ”تیا پھر کھر بھر گا بوجھ اور ذمہ داریاں تن تنہا ادا کرنے کا شوق راہ میں رکاوٹ ہے۔ اتنے سارے نامزدے لے رکھے ہیں کہ خود پہ توجہ دینے کا وقت ہی کہاں بچتا ہو گا ان کے پاس۔ اس لحاظ سے دیکھو تو کبھی کبھار بھیا کی اتنی جائز بھی لگنے لگتی ہے۔“

دو سری بھابی مہ پارہ ہیں لقمہ بھیا کی بیوی۔ شیخ چلی کا زمانہ روپ سمجھ لو۔ منصوبے بنواؤ ان سے جتنے مرضی اور ان پہ پانی بھی پھو لو۔ آرام کرنا اور کرتے رہنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، جس طرح خیالی پلاؤ پکانے میں ان کا کوئی خالی نہیں، اسی طرح ساری بھابیوں میں اولاد کے معاملے میں بھی وہ سب سے بڑھ کر خود کفیل ہیں اور دوبار تو اپنا ریکارڈ بستر بنانے کی غرض سے انہوں نے جڑواں شاہکار بھی پیش کیے۔“

”سانوں دی نال اپنے لئے پھیل دے۔“

اسے اہل خانہ کے راجس یا نہیں آگے پیچھے ٹھونسنے کا
یہ عاشق تھا لیکن اس کے اس شوق کی خاطر خواجہ
صاحب کو چلنے میں اتنی احتیاط کرنی پڑی گویا کچھ بھرے
راستے سے اینٹوں پر پاؤں دھردھرنے کے گزر رہے ہوں۔
اس وقت بھی چلنے کے اسی اسٹائل کی وجہ سے اور
بوناہ لویڑنے والی جھاڑ میں گر مہران پہلے سے محاط ہو
گیا۔ اس نے محط کو الوداعی کلمات کہے اور ریسیور رکھ
کر یہ نامووب ساہو کے خیرنامہ دیکھتے لگا۔ نیوز ریڈر اس
وقت موٹروں کے حالات - تاریا تمام

یہ تم لیا نکار بیٹھے ہو، بخوش کا لیندو، وہ ذرا اسٹار
 ہیں تو اٹاٹا۔" دونوں پاؤں اوپر کھینچ کر خواجہ خلیق
 کے طرف بڑی فرست کے ساتھ صوفے پر جم گئے۔ وہ
 جہیز ہو کر رہ گیا۔ ESPN پہ میچ لگنے والا تھا اور وہ باہر
 جانے کا پروگرام ٹینسل کرتے ہوئے صرف یہ میچ
 دیکھنے کے لیے بیٹھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر میں صرف
 ایک ہی ٹی وی تھا۔ بس وہیں اپنے جینز میں بھی لی پوی لے کر
 آئی تھیں لیکن ایک گھر میں بیٹیاں دینے کا شیخ صاحب
 یہ نہ دندہ ہوا کہ ان کی سفید پوشی کا بڑی آسانی سے نباہ
 ہو گیا تھا۔ ملاقات اور مزاحہ کو ایک ہی ٹی وی ملا اور ایک
 ہی واشنگ مشین۔ کالی عرصہ دونوں ہمیشہ مل کر
 کپڑے دھوتی رہیں اب دو تین سالوں سے الگ الگ
 دھل رہے تھے لیکن ایک ہی مشین استعمال ہوتی
 ایک دن ماہ لقا لگا لیں، دوسرے دن ماہ پارہ۔ یہی
 طریقہ لی وی دیکھنے کے لیے بھی رائج تھا۔

قرقان اور قنباہ کو ملنے والے کمروں کے آگے مختصر سی لالی ٹی اس میں لی وی رکھ دیا۔ وہ جہیں اور وہ ناز دونوں کو بھی ایک ہی لی وی، ایک ہی فریج اور ایک ہی واشنگ مشین میں نمٹا دیا گیا۔ ہیڈ روم فریجز البتہ سب کو الگ ملے تھے۔ ان کے ذاتی استعمال کے فریج کے علاوہ خواجہ صاحب نے مزید لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ تو یوں بھی جینز کے خلاف تھے۔ ضرورت کا سب سامان گھر میں موجود تھا۔ بڑے لاؤنج میں ان کا اپنی لی وی رکھا

www.eaksociety.com

ہے وہی ہے ہاں کیونکہ سانس بھی کبھی ہو
تھی۔۔۔

”لو ہو تم لگاؤ تو سہی اس سے پہلے وہ کہانی گھر گھر
کی لگتا ہے۔“ ان کے بار بار کے اصرار پر زنج آتے
ہوئے اس نے اپنا ناپسندیدہ چینل لگا ہی دیا۔ اسکرین پر
بتاری سائڑھی میں بلوس ایک سائولی سی عورت فل
میک لپ کے ساتھ ہنڈیا میں ڈوٹی ہلا رہی تھی اس
نے اوجھرا دھڑکیا اور پلو میں چھپا کے رکھی زہر کی
شیشی کھانے میں اندل دی۔

”بائے بائے“ سیسی بھتی تیرا پڑی غرق۔“ می
جان بھی افسوس سے ہاتھ ملتے آئینہ میں۔ انہیں ہر
سین پر بے لاک تبصرہ اور وہ بھی لائیو کرنے کی عادت
تھی۔

اگلے سین میں بڑی بھابی کے کسی جذباتی سین کی
داویجے ہوئے خواجہ صاحب نے جمائیاں لیے مران کو
مناظر کیا۔

”کیوں؟ یہ بے راہ روی سکھائی جا رہی ہے؟ یہ
بہارتی ڈرامے خانہ فلوں کو مل بیٹھنا سکھا رہے ہیں
ترانوں کو دس دے رہے ہیں۔“ وہ بہت بڑے فین
تھے ان سیریز کے اور اب بیٹے کو بھی متفق کرنا چاہ
رہے تھے۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ ہندو معاشرہ ہم سے
بہتر ہے لیکن جو باتیں ہمیں اپنی چاہئیں ہم سے سیکھ
کر لانا چاہیے۔“

”جی نہیں“ آپ کا تجزیہ اتنا درست بھی نہیں الٹا
ہم ان کا اثر لے رہے ہیں۔ یہ ان کا کلچر ہے وہی معا
بہارت والا اور رامائن والا۔ معا بہارت میں کیا ہے
خاندانی جھگڑا اور فسادات سے بھری پڑی ہے
پانڈوں نے لیا لیا نہیں کیا اپنے ہی خون کے ساتھ اور
وہ رامائن سوئی ماں کی سازشیں بھائیوں کے آپسی
اختلافات یہ تو حال ہے ان کی مذہبی کتابوں کا۔
صدیوں سے یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک
چھت تلے رہنا ہے اور ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنا
ہیں۔ یہی سب کچھ ان ڈراموں میں ہوتا ہے پورے
گھر اسنے میں کوئی ایک فرقہ پارہ سا ہوتا ہے باقی سب

ہوا تھا جو کہ ان کے اور مران کے درمیان وجہ تعلق
تھا۔ انہیں لمبی لمبی قسطوں تک چلنے والے ڈرامے
بہت پسند تھے اور وہ نیشنل جیو گرافکس اسپورٹس
چینل یا پھر کبھی کبھار HBO پر کوئی فلم دیکھنا پسند کرتا
جو کہ اپنی جان کو سخت ناگوار گزرنا اب بھی مسلسل پروہنا
رہتے تھے۔

”ایک تو کیبل والے کو بول کر اشارے کھلوا لیا
ہے، کم بخت رات کو چند گھنٹوں کے لیے لگا رہا ہے ورنہ
اس وقت لگنے والے سارے ڈرامے سکون کے ساتھ
دیکھ کر دیکھ لیا کروں تمہارے ساتھ بیٹھ کر نہ کرنی
پڑے۔“

”مذہب حکومت کی طرف سے بھارتی چینلز دیکھنے
پر پابندی ہے تو کیا ضرورت تھی کیبل پر بیٹھ کر
ورغلانے کی۔ یہ ایک قانونی جرم ہے۔ آپ کا کیا
جائے گا؟ کسی نے شکایت کر دی تو اس کو توبہ کا
لائسنس ضبط ہو جائے گا۔“ چارہ کیا کرے؟ آپ جیسے
کسٹمر دھمکیاں دے دے کر یہ سب کرنے پر مجبور
کرتے ہیں۔“ اسے تو یوں بھی ان کی بات سے خفا
تھی بند ہونے پر سکون کا سانس پاتا تھا۔

”میری کچھ سے بات ہے۔“ وہ اپنے بڑے بھائی سے
کرنے سے کیا حاصل؟ یہ تو کئی اور باتیں ہیں ان سے
مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں ان کی اوت بنائے ہیں تو
بڑے شوق سے دیکھتے ہو۔“ انہوں نے اٹھ اٹھ کر
”ان کی فلمیں زیادہ تر تصوراتی ہوتی ہیں۔ یہ
ڈرامے سیدھا ہماری گھریلو زندگی پر اشارہ کرتے
ہیں۔ ان ڈراموں کے ذریعے وہ دور کا کلچر پر کار
رہے ہیں۔“

”خاک وار کر رہے ہیں“ میں تو کہتا ہوں سدھار
رہے ہیں۔ اپنے ڈرامے اٹھا کر دیکھ لو اسے گنگ قتل
وغارت خاندانی دشمنیاں جبر کے اور ان کے ڈرامے
سیدھی سادی گھریلو کہانیاں بہنوں کا ادب کرنا سکھا
رہے ہیں مل جل کے رہنا سکھا رہے ہیں لگاؤ تم
جلدی سے۔“ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

”ابھی آپ کے پسندیدہ ڈرامے میں کافی وقت

وہیے بھی جبران سارہ بات تو گری نہیں سکتا تھا۔
 ”مطلب یہ الی کہ قصور کے آئے روز کے پھیرے
 کوئی اور کہانی بتا رہے ہیں۔“

”تم نہ باز آتا ہوا کیاں چھوڑنے سے۔ ارے قصور
میں تو تارے کنی کسٹھریں۔ بزنس ڈھنگ کے لیے جانا
ہی پڑتا ہے۔ میں خود بھی جاتا رہتا تھا۔“
لیکن آپ حقے میں دو دن تو وہاں نہیں گزارتے

تھے اور آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں الٹی کہ اس قسم کی
ڈیلنگ میرا کام ہے۔ بھیا کے ذمے تو آپ نے آفس
کے اندرونی معاملات اگا رکھے ہیں۔ "جبران کا اٹھنا
نکتہ ٹھیک سے خواجہ خلیفہ الرحمن کے دل پر لگا۔

انہیں سوچ میں پڑتا دیکھ کر وہ اور پر جوش ہو گیا۔

میں تک نہیں آئی جس کا ذکر کر کے وہ سارا سارا دن
آفس سے غائب رہتے ہیں۔“

”ہوں۔ یہ تو یہ سنا ہی۔ بچپن کی عادت ہے جپ چماتے کارنامے انجام دینے کی۔ جتنا مشین

شیطان نہیں۔ تمہیں ٹھک ٹھاک صاف وال میں بھی

کالہ رائے ڈالنے کی عادت ہے۔ ہمیشہ کے وہی اور شکی طبیعت رکھنے والے خواجہ صاحب کھٹک ضرور گئے

تھے لیکن جبران کی لنگٹی، بھجائی کی عادت سے بھی واقف تھے اگر اُسے تمہیں کرنا نہ بھولے۔



یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حواجہ صاحبہ!

”آپ کا داغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”آپ سبھا تو نہیں ہو گئے ہیں؟“

”کہیں آپ کو باؤ لے سکتے تو نہیں کاٹ لیا؟“

ان کے چہرے پہ ان سارے سوالوں کی جھلک واضح تھی کہ خود خواجہ صاحب گڑبدا گئے۔

www.1

”بھئی صاف صاف الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ ماہ نور کی جگہ میں ماہ گل کو دینا چاہتا ہوں۔ یعنی اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے اب بھی آپ ہی کے گھرانے کے آگے طلب گار ہوں۔“

”یہ تو آپ کی محبت ہے خواجہ صاحب۔“ وہ متوجش تھے۔ ”لیکن دیکھیں جی، محبت اس قدر اندھی بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

”نہیں؟ کیا مطلب؟“

”مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ ایک تو مہران جیسے اور ماہ گل کی عمر میں آدھو آدھو (دکن) کا فرق اور دوسرا خود ماہ گل کی عمر۔ وہ تو ابھی ساتویں جماعت چڑھی ہے، گریزوں سے کھیلنے کی عمر ہے اس کی۔ شادی تو بہت دور کی بات ہے۔“

”مثلاً۔۔۔ کتنی دور کی؟“ وہ تحمل سے پوچھنے لگے۔

”تقریباً“ تھوڑے دس سال تک۔“

”تو ٹھیک ہے، ہم انتظار کر لیں گے، تھوڑے پھر دس بارہ سال تک کر لیں۔ اب تو آپ کا یہ ایش دور چلا ہے کہ اس کی گریزوں کے ٹھیننے کی عمر ہے۔ بارہ سال بعد تو یقیناً“ آپ اس کا یہ شقی چھوڑا بیٹے چلے گئے۔“ بلکہ کچھکے انداز میں اپنی انست میں انہوں نے بڑا نفیس مذاق فرمایا تھا لیکن شیخ صاحب کی سنجیدگی ہندو برقرار تھی۔

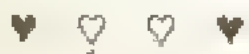
”آپ نے میرے دوسرے اعتراض یہ غور نہیں کیا خواجہ صاحب۔ مہران اور ماہ گل کی عمروں کے درمیان موجود کئی سال۔ یہ فرق بارہ سال بعد بھی جوں کا توں برقرار رہے گا۔ آج مہران کے مقابل ماہ گل کا جوڑ ایک بچکانہ سا خیال لگ رہا ہے تو کل ماہ گل کے سامنے مہران پھٹکے خیز لگے گا۔ دس سال بعد آپ کا بیٹا چالیس سال کا ہو رہا ہو گا۔ میرا اعتراض تو تب بھی یہی ہو گا۔“

”یعنی۔۔۔ آپ کو یہ رشتہ آپ انکار کر رہے ہیں۔“ بڑی بے یقینی سے کہتے ہوئے انہوں نے فکست خورہ انداز میں پوچھا۔ لہجے میں شکستگی اور

آنکھوں میں حسرت اتنی نمایاں تھی کہ برہم سے شیخ نذیر حسین بھی چیخ گئے۔ وہ خواجہ صاحب کی اس خواہش کے پس منظر سے بخول آگاہ تھے۔ پہلے سے ہی جانتے تھے کہ اپنے بیٹوں کے لیے ان کی بیٹیوں کا انتخاب کرنے کی وجہ کیا تھی لیکن یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ اس حد تک آگے چلے جائیں گے۔ ان کا مقصد ٹیک سی لیکن یہ فیصلہ انتہا پسندانہ تھا۔

”میں معذرت کر رہا ہوں۔ آپ سے اتنے برسوں کے تعلقات ہیں۔ اگرچہ آپ سے رشتہ بڑا نازک سا ہے، بیٹیوں کا سہم ہیانہ وابستہ ہے آپ سے لیکن سالوں پرانی دوستی کے ناتے اتنا کہنے کی ہمت کروں گا کہ ذرا جذبات سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا میں آکے دیکھیں۔ آپ نے کس قدر آرام سے کہہ دیا کہ آٹھ تو کیا بارہ سال انتظار کر لیں گے۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں خواجہ صاحب؟ یہ انتظار آپ کو نہیں کرنا، آپ کے بیٹے کو کرنا ہے۔ ہمیں شکر کرنا چاہیے۔ اس دور میں بھی ہماری اولادوں نے اپنے مستقبل کی ذمہ داری ہمارے ہاتھوں میں تھما رکھی ہیں۔ لیکن اس اختیار کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ نیک، تابعدار اولاد کا عطیہ ہوتی ہے، کیا اس عطیے کو صرف اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ضائع کر دینا چاہیے؟ اس بارے میں ضرور سوچیں۔“

وہ خواجہ صاحب پہ سوچ کے کئی دورا کر گئے وہ مہران کو اچھی طرح جانتے تھے اور ماہ گل سے اس کی انیسیت سے بھی واقف تھے۔ اس لیے صرف انکار پہ اکتفا نہ کیا بلکہ دوستی کا استحقاق استمال کرتے ہوئے تھوڑی بہت گرد بھی صاف کی جو خواجہ خلیق الرحمان نے اپنی خود پسندی اور اختیار پسندی کے زعم میں دل و دماغ پہ پھیلار رکھی تھی۔



اگلے چند روز خاموشی سے گزرے۔ اگرچہ خواجہ خلیق الرحمان نے آنے کے بعد کوئی بات کی نہ کسی نے کریدنا چاہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سب

لا علم تھے۔ وہ جہاں سے ہو کر آ رہے تھے وہاں کی "چار کھڑکیاں" خواجہ ہاؤس میں سطلی تھیں۔ جنہوں نے ایک ایک منظر سب کو دکھا دیا، لیکن منسلک سب ناموش رہے۔

میران کو جہاں اس سلسلے کے شمع ہونے کا احساس
اطمینان بخش رہا تھا وہاں الہی کی خاموشی اور اضمحلال
خاطر، رعب و ہراس کے وجہ رہا تھا۔ حقیقہ خاتون بھی

اگر وہی سے شوہر کو دیکھ کے رہا تھا۔۔۔ جب چپ چاپ غصہ تھے کہ کب اس سے مل سکتے ہیں۔۔۔

میں نے اس کے لئے ایک اور چیز بھی کرنا چاہی تھی۔

وہیں پر گیس۔ وہ کسی ایسی جگہ سے نکلتا ہے جہاں

بازوئے کی دے ہوئی کہ وہ اس کے ساتھ

چاہتے تھے اور ان کی اسی تکیہ پر کھڑے ہو کر ان کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

میں تھامے لیٹ میں بیٹھ کر دیکھتا ہوں۔ وہاں سڑاق ہوئی
نظروں سے انہیں دیکھنے والی ہیں۔ انہیں اجازت ہے

”خدا دے!“ رضی بھانسا ہوا آیا اور پیچھے سے اپنے

”نہیں بیٹا۔“ انہوں نے پوچھتے کہا تھا چوہا۔

تھیں۔ جب بھی آپ کے پاس جانے لگتا تھا، بڑی ماموں کو دیکھتے کہ وہ کی طبیعت تھیک نہیں۔ ”وہ تالی کو

بہن کی شادی کی دعوت دیتے پوری فیملی بھی آتی تھی۔
 امی آپ کو تو یاد ہے ناں؟
 ”ہاں بابا، بڑی بھلی خاتون ہیں۔“
 ”ان ہی کی بھانجی ہے معطر۔“
 ”معطر؟“ دادو مرکا مرکا سا تروتازہ سا نام ہے۔

چھوٹی بھانجی نام پہ ہی خوش ہو گئیں۔
 ”اب تو یاد ہے ناں بابا، کیا فرق پڑتا ہے چلو
 میں! تم نے تو کہیں ہاں رہا، کب کب ہو میں۔
 روتے روتے اس نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔
 میری عمر تو اس وقت تھی کہ میں اس کے ساتھ صرف یہ
 روتی رہتی تھی کہ اس نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔
 شہر میں اس نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔
 بڑی بھانجی نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔
 وہ بالائی آبادی کے تھے۔
 میں نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔

اس نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔
 بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے اسے بھانجی کے لئے لے لیا۔
 خاتون راحت کی مانند ایک تھکاتے ان کی ہمراہی
 میں یہ رشتہ لے کر ہی نہیں اس لیے روایتی تکلفات
 کا دور نہ چلا ”ترکی کے ماہوں نے غمناک وی اور بغیر کسی
 پس و پیش کے مجھ جیہوں سے غفرنے یہ رشتہ قبول کر لیا۔
 اب تک خواجہ خلیق الرحمان کے کسی رویے سے نہ
 لگ رہا تھا کہ وہ اس رشتہ پر دل و جان سے راضی ہیں۔
 مہراں ان کے چہرے پر حقیقی مسرت تلاشتا ہی رہا لیکن
 وہاں فقط اندیشہ تھے۔ ہر اس تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا“ اس نے خود کو تسلی
 دی۔ معطر پہ پورا بھروسہ تھا کہ وہ جلد ہی الٹی کو اس خود
 سافٹ خوف سے آزاد کر دے گی۔ اسے بس آنے
 والے وقت کا انتظار تھا۔ وقت جو خود سب ثابت کر
 دے گا لیکن اس سے پہلے جبران نے ثابت کر دیا
 کہ۔

ہو ایوں کہ الٹی تو اسے فرقان کی سرگرمیوں پہ نظر

رکھنے کا کہہ کر خود بھول بھال گئے بلکہ تازہ رو نما ہونے
 والے واقعات نے یہ بات ان کے ذہن سے یکسر مٹا
 ڈالی۔ دیگر افراد بھی اس سرسری سے ذکر کو یاد نہ رکھ
 پائے، یوں بھی جبران کی تو عادت تھی اوجھرا دھڑکی
 پھیلا نا سب لیکن اب۔۔۔ اب اس نے جس وثوق
 سے یہ دھماکا کیا اس نے سب ہی کو ہلا کر رکھ دیا ویسے
 بھی یہ دھماکا گئی ہو۔ اتنی بڑی بات بغیر بے پر کے تو نہیں
 اڑا سکتا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ اگر جبران نے
 مفروضات کا پہاڑ ٹکڑا بھی کیا ہو گا تو کہیں نہ کہیں تہ
 میں رہائی ضرور ہوگی اور اس ذرے کی چیخیں ہی اتنی
 شدید تھیں کہ سب بے چین ہو گئے۔ سب سے بڑی
 حالت بڑی بھانجی کی تھی وہ جلے پیر کی ملی کی طرح شوہر
 کے انتظار میں پھرنے لگیں ان کی پچھلی ہولی مٹھلیوں
 پچھپاتے یوں، شرر پکاتی نگاہوں سے سب کو اندازہ
 ہو رہا تھا کہ آج بڑے بھیا کی کیا اور گت بنے گی اور ان
 سے بھی بڑھ کے تلملار ہے تھے خواجہ صاحب مہراں
 بھی باقی سب کی طرح حیرت زدہ تو تھا لیکن دم بخود نہیں
 کیونکہ مجھانے کیوں۔۔۔ بھیا کی کسی اواپ وہ پہلے ہی
 کٹک سا گیا تھا۔

بھانجی سے انہیں لا تعلق دیکھنا تو معمول کی بات
 تھی لیکن اب کھلم کھلا بیزاری کا اظہار یہ اعلان بست
 پہلے کر گیا تھا کہ اب ان کی نظروں میں کوئی اور بچہ لگا
 ہے۔

”بڑے بھیا قصور میں سب سے فیکٹری کی سپروائزر
 فریدہ مقبول عرف فیرو میں دلچسپی لے رہے ہیں۔
 موصوفہ بیوہ مشہور ہیں۔ یہ الگ بات کہ عمر چھبیس
 ستائیس سال سے اوپر نہیں لگتی اور رنگ ڈھنگ
 سولہ سترہ سال والی دہشتناکوں والے ہیں۔ ایک معمولی
 سی پوسٹ پر چھ ہزار تنخواہ کے ساتھ ٹھٹھا بٹھ دیکھنے
 سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بات کا اشارہ ہے کہ بھیا یا
 بھیا کی طرح ہی کچھ اور قدر دان خاصا توازنہ رہتے
 ہیں محترمہ فیرو کو ہفتے میں دو یا پھر ایک چکر تو ضرور ہی
 لگتا ہے بھیا کا قصور میں۔“

یہ انکشاف کر دینے کے بعد وہ ایک طرف بیٹھا

گنہ گریاں چوستے لگا۔ نہ جینیں بھابھی شانے۔ بیک
 نکائے جانے کو تیار تھیں اب ہانگپ ہانگ چڑھا کے
 صوفے پر براجمان ہو گئیں۔ مہ بارہ بھابھی اپنے
 اسنوڈ تھیں کوچھ کا ساڑھ رٹنے کے لیے دے کے اسٹک
 سمیت ہی آکر ان کے برابر ٹک گئیں۔ دونوں نے پہلی
 فرصت میں فون کر کے اپنے اپنے میاؤں کو بھی بلوالیا
 تھا مگر وہ اس تھری سے محروم نہ رہیں۔

مہ ناز تیسف سے اپنے لٹائے ہوئے مزاج سے ہر
 کچھ تھیں جت صبر تھیں کی سلیٹی کا جیس تھا نہ
 معاملہ کی نزہت بلکہ ان کی بات حق کی تھی تب بھی
 اسے توں سرور بھانڈا چھانڈنے سے باز نہ رہا۔ اب اس کی
 کو مطلع کرنا چاہیے تھا کہ وہ بھی اب اس کے
 اسے نہ لیتے۔ اس طرح بات بات میں اس کی
 آکر پوب بھیا کے سر سے اتار دیتے۔

تھان اور تھان تھان تھان تھان تھان تھان
 ہوئے۔ انوں کو اصل تھان تھان تھان تھان تھان
 انوں کی تھان تھان تھان تھان تھان تھان
 شوق ان کی طرح تھان تھان تھان تھان تھان
 سے فیض و بہار تھان تھان تھان تھان تھان
 ہوئی۔ سب "تھان تھان تھان تھان تھان تھان
 متحرک قدم تھان تھان تھان تھان تھان تھان
 کا شغل ترک کیا۔ فقط انی جان تھان تھان تھان
 کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ سب معمول پاپ چاپ تھان
 والے گرائے چار ہی تھیں "اب اور زیادہ تھان
 و خضوع سے والے کرنے کے۔ بان کے سائے میں
 بچھلے برآمدے سے آتی آجی و رجن بچوں کی آواز بیک
 گراؤنڈ اسکو رکام دے رہی تھی۔

چھوٹی بارہ

چھوٹی بارہ

ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے بھیا کا پہلا قدم جیسے ہی
 اندر پڑا "تمام اہل خانہ کو ایک ہی سے تاثرات سجائے
 دیکھ کر تھم سا گیا۔

"السلام و علیکم۔۔۔" الجھے ہوئے سے انداز

میں سلام کرتے ہوئے انہوں نے پھر سے نظروں ہی
 نظروں میں سب کو جانچا۔

"اوہ۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا، آج اپنے مہو کی
 تاریخ رکھنے جانا تھا ناں۔۔۔ چچ چچ۔۔۔ آپ سب شاید
 میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بس دس منٹ اور۔۔۔
 میں شاور لے کر چھٹیج کر لیتا ہوں۔ واقعی بہت دیر ہو گئی
 لیکن آپ سب بھی تو کمال کرتے ہیں، مصروفیت میں
 میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی تو آپ میرے
 مقابل پر رنک کر لیتے۔"

بڑی غفلت کے ساتھ کہتے وہ اپنے کمرے کی طرف
 باتے کہنے کی اہی کی سرو آواز نے ان کے قدم اور
 اعصاب دونوں مجمد کر دیے۔

ان کی اہلی نے پہلی بات یہ کہ مہو کے دن رکھنے
 کی تاریخ اتار دینا تھا اور دوسری بات یہ کہ جب تم
 کو لے کر آؤ گے، ساتھ ہی دوتے ہو تو اپنا موبائل بند رکھتے
 ہو، کیونکہ میں ان تیسرا باپ بھی مر جائے تو تمہیں اس
 کی اطلاع نہ ملے گی اور مہو کی بھی نہیں چاہیے "منفٹے
 ہو کر مہو کی سہیل بعد تم سو گئیں کے ساتھ بیوی کی
 سہیل کی آواز آتے ہوئے "جوان ہوئی اولاد کے
 ہاتھ، ستانی و کھاتے ہوئے اور بوڑھے باپ کی
 اچھا دیا میں دھول بچھ نکلتے ہوئے اس سے ملنے جاتے
 ہو، کسی کو یاقین کہ وہ تمہاری خلوت میں دخل دے
 گا۔"

خواجہ فرقان ایک بھٹے کے ساتھ چلتا چاہتے تھے
 غلام چھوٹے بھائیوں اور بھانج کی مودگی میں بھید
 لٹل جاتے کی خیانت نے انہیں منہ پھیرے رکھنے پہ
 مجبور کیا۔ ان کا کترایا کترایا پشیمان سا انداز دیکھ کے مہ
 لقاڑھے گئیں۔ نبھانے کیوں اس قدر طیش کے عالم
 میں بھی انہیں امید تھی کہ وہ اس الزام پہ بھڑک انھیں
 گے "جبران کو ڈانٹ ڈپٹ کر یہ کھلو الیں گے کہ وہ مذاق
 کر رہا تھا اور یہ امید تو شاید سب ہی کے دلوں میں تھی
 جب ہی بھیا کا خاموش اعتراف سب کو ملال دے گیا۔

"مجھے مجھ سے یہ امید نہ تھی فرقان۔ تو تو۔۔۔ تو تو

میرا سب سے میدھا سا سا پیا بچہ تھا۔" امی جان

”اُوہو آپ کیا جانتے ہیں بھلا، کئی سال سے ہمارے نام چند شخصوں کے لیے آفس آتے ہیں وہ بھی مہینے میں ایک دن، نئی نئی ڈیپلٹمنٹ کرنا میرا کام ہے آپ کو نہیں۔“ اب جوانی کا رویہ والی کے طور پر جبران نے یہ دہائی کرائی کہ آؤ آف اسٹیشن ڈیپلٹمنٹ اس

”ان محترمہ کا بس چہ لو یہ سب ہی کروائیں۔“
 ہے۔ آپ نے بیوی نہیں بیڑا منٹا میرے سر پر
 رکھی ہے ائی۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس کی زیر ہدایت
 زندگی گزار گزار کے۔ یہ مجھ سے بڑی ہے ماننا ہو
 لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر وقت ہی اپنا بڑا چر
 ثابت کرنے پر تلی رہے۔ میں نے ہزار بار اسے
 سمجھانے کی کوشش کی کہ بیوی ہو بیوی بن کے رہو
 اماں مت بنو۔ لیکن اس نے ہمیشہ میری بات کھٹی
 طرح اڑا دی ”اب بھلتے۔ اے اماں بننے کا شوق ہے
 اپنا شوق پورا کرتی رہے۔ مجھے بیوی کی ضرورت
 ہے۔“ ”عیش میں کھلتے کھلتے ہو سب کچھ کہہ
 گئے۔ ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اتنی دیر سے
 ہو رہے ہمارے گھر سے جا رہے تھے۔ سب منہ کے

منہ میں بدبو اگر سہم گئے۔ بھابھی بھی انہیں کمزور پڑتا دیکھ کر سنبھل گئیں۔

”مچلو اپنے کمرے میں۔ اب تمہاری کوئی شکایت نہ سنوں میں، سمجھ۔ اور وہی تمہاری وہ فیری سیری تو۔ ایسی حیثیتوں کی حقیقت میں اچھی طرح جانتا ہوں اور تمہیں بھی عیاں کر دوں گا۔ جبران!“

”جی الی!“ وہ آخری گنڈیری کی باقیات منہ سے اٹھ کر اڑت ہو گیا۔

”وہ ان کے اندر اندر اس چمک چمک کا سارا اکیلا چمکا رہا ہے۔ اس کے سامنے لاؤ۔ ذرا اس کے عشق کا بخار پاترے۔“

”اب تو ان کے لیے کسی ڈپٹی کھولنے کے لیے یہ رات بہت زیادہ تھیں۔ اگلی رات وہ تمام ثبوت سمیت موجود تھا۔“

”ہام تو اصل ہی ہے یعنی فریدہ البتہ وہ نہیں ہیں۔“

”اب ان کی ملاقات یافتہ ضرور ہیں۔ سپروائزر کی معمولی سی سیٹ کی بھی اہل نہیں یعنی صرف مل پاس ہیں۔“

”صرف اپنے تعلقات کی بنا پر بیکنگ کرل سے ڈائریکٹ اس سیٹ تک آئیں۔ ان کی بڑی ہمشیر و رشیدہ عرف

رہنما اپنی ان ہی خاندانی حرکات و سکنات کی وجہ سے

جیل میں ہیں۔ والد صاحب ابھی کچھ روز قبل بڑی دختر

سے ملاقات کر کے آئے ہیں۔ ان کی یہ ملاقات

تقریباً ”چار سال جاری رہی“ جرم منشیات کی فروخت

تھا۔ مس فیروہ ہماری ہی کمپنی کے اسٹنٹ منیجر اور

اکاؤنٹنٹ کو بھی اپنی زلفوں کا سیوٹا چمکی ہیں۔“

اس نے مختلف کاغذات ثبوت کے طور پر سامنے

پھیلا دیے۔ چند اخبارات بھی تھے۔ ایک میں اس کا

باپ جھکڑی لگائے انڈوں بیٹھا تھا، دوسری میں بڑی

بسن کا خوفناک سا کلوز اپ تھا ”بلک میلر حسینہ“ کے

کیپشن کے ساتھ اور ایک دبیر کے سستے سے اخبار

میں وہ بذات خود براجمان تھیں اپنے سابقہ شوہر کے

الزامات کے ساتھ جن کے مطابق مس فیروہ کا کام ہی

شادی کے بعد مختلف جھکڑوں کے ذریعے شوہر کی

دولت اچھیا لینے کے بعد طلاق پہ مجبور کرنا ہے۔ فرقان

عمر گئے۔

”تو کیا آپ نے۔ آپ نے دوسری شادی کر

لی؟“ بھابھی صدمے سے سفید پڑ گئیں۔ الی بھی پہلے

خوب گرج چمک رہے تھے لیکن اب بیٹے کی ڈھٹائی

کے مظاہرے سے ڈھیلے پڑ گئے۔

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

”نہیں۔“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“ ”تو تو“

بھیا کا سر شرم اور افسوس سے جھک گیا۔

”باپ کی پسند یہ بڑا اچھل اچھل کر اعتراض کر رہے تھے۔ یہ ہے تمہاری پسند۔ جراثیم پیشہ گھرانے کی بدنامی کی بد معاش عورت۔“

وہ جب چاہا اٹھ کے اپنے کمرے میں چل دیے۔
”چلو آٹھو“ تم سب بھی اپنے اپنے کمرے میں جاؤ۔
تماشا ختم ہو چکا اور مد لقا۔ تم رو بیٹی۔“

سب کے جانے کے بعد انہوں نے بڑی ہو کو قریب بلایا اور کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے جیسے بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

”بیٹی! تماشا واقعی ختم ہوا لیکن... کچھ کہہ نہیں سکتا کہ دوبارہ یہ تماشا کب لگے۔“

”نہیں ابی! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے ہوتے میں کبھی کمزور نہیں پڑوں گی۔ آپ ہی میری طاقت ہیں اور میرا سائبان بھی۔“

”اور میرے بعد؟ خود اپنی طاقت آپ بنو بیٹی۔ تم سے بستر تمہاری حفاظت کوئی اور نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں۔ تمہاری قسمت! اچھی تھی کہ اپنے غلط جگہ رلا۔ کھیا ہٹ اور شرمندگی سے اس کی ہمت کمزور نہ رہتی ہے۔ اس کی ہمت دوبارہ پیدا کرنے سے پہلے پہلے اسے سنبھال لو“ قابو میں کر لو۔ تمہارے پاس یہ بڑا اچھا موقع ہے۔ بس تمہیں خود کو بدنے کی ضرورت ہے۔“

”جی میں سمجھتی نہیں۔“

”تمہاری سمجھ بھی اس فیقے کے ساتھ رہ رہ کر کم ہو گئی ہے۔ ویسے تو یہ گھر ہمیں بنانا تمہاری سانس کی ذمہ داری ہے لیکن انہیں آنسو بہانے اور تسلیج کے دانے کرانے سے ہی فرصت نہیں۔ یہ بس اتنی سی مدد کر سکتی ہیں کہ شانے سے لگ کے ہمدردی کے آنسو بہا لیں یا ساری رات مٹتے پہ بیٹھ کر دعائیں مانگ لیں۔ خیر دعائیں ان سے لے لو اور دوا داروں میں بٹلائے دیتا ہوں۔ فرقان اب کوئی لونڈا لپاڑا نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تم اس پہ توجہ دینا ہی چھوڑ دو۔ اسے عمر تو جیسے جیسے بڑھتی جائے، مرد زیادہ توجہ مانگتا

ہے اور ایک تم ہو کہ سارا سارا دن گھر اور گھر داری میں الجھی رہتی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھر کی ذمہ داریاں اپنی جگہ۔ لیکن زائد اور دوسروں کے حصے کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر تم ان کا حق مارتی ہو جو تم سے وابستہ ہیں۔ ان میں تمہارا شوہر بھی ہے اور تمہارے بچے بھی۔“

تمہارا شوہر اندر کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوتا ہے۔ تم بھانجے بھتیجیوں کو نسلدار ہی ہوتی ہو۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا آتا ہے، تم مشین پہ دھڑا دھڑا ہنسنے کے کپڑے پہنے جا رہی ہو۔ ذرا خود کو بدلو! اپنی ذات پہ توجہ دو۔ کام کی زیادتی نے تمہارے چہرے کی رونق تباہ کر دی ہے۔ اپنی ہنسون کی طرف ہی دیکھ لو۔ وہ مہ پارہ چار ہنچے پھر کی بنائے رکھتے ہیں، انہیں اسکول بھیجنے کے بعد مزے سے گھنٹوں سوئی رہتی ہے، دودھ جوس پیتی ہے۔ وہ گوجھی ڈاکٹری کیسے ٹپ ٹاپ سے رہتی ہے اور چھوٹی ہو، تمہاری طرح اسے بھی کام کا ہو کا ہے لیکن خود سے لاپرواہ نہیں رہتی۔“

اب کی ساری بدایتیں مد لقا بھیا بھی نے بڑے دھیان سے سنیں اور ان پہ عمل کرنے کا مصمم ارادہ بھی کر لیا۔ اس سے پہلے بھی اکثر کوئی نہ کوئی انہیں اس بات کا احساس دلاتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتیں۔ اس بار سنجیدگی سے غور کیا، سو کر ہی ایسی گلی تھی کہ وہ محتاط ہو گئیں۔



”دو صبی سب دو صبی بتر۔“

خواجہ صاحب آوازیں دیتے اندر آئے۔ ڈوماند حسب عادت ان کے پیروں کے آگے پتھپتھ کر رہا تھا۔

”جی دوا! وہ ستا ہوا چہرہ لے کر سامنے آیا۔
”یہ نمک پارے اور ٹٹکے لے جا کر اپنی چچی کو دے آؤ“ شام کی چائے کے لیے وہ وہیں پہن میں ہو گی۔
چائے کا وقت ہو چلا۔ ”گھڑی پہ وقت دیکھتے وہ شفیقہ خاتون کے برابر آئیں۔ ان کی روٹی روٹی آنکھیں دیکھ کر سنیں۔“

”مہ جیس چچی تو بچن میں نہیں، میں لفافے رکھ آیا ہوں۔“ وہ اطلاق دے کر بھاگنے لگا۔
”ارے تو جاؤ ذرا دروازہ کھٹکھاؤ، چھ بجنے کو ہیں۔“
”کب ملے گی چائے۔“

”نہیں؟ میں دو؟“ وہ سہم کر اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ خواجہ صاحب کی سمجھ میں اس کا تردد نہ آیا۔

”وہی!“ بند دروازے کے پیچھے اسے مہ بارہ کی غضب ناک آواز آئی اور وہ تیرگی طرح اپنے کمرے میں گھس گیا۔

”کس قدر نامعقول بچہ ہے۔ میں نے کہا چچی کو جگاؤ، اپنے کمرے میں بھاگ گیا۔“ وہ بڑبڑاتے لگے۔
شفیقہ خاتون بیروں میں چپل اڑنے لگیں۔

”بچہ بیچارہ کیا کرے۔ ماں کا حکم نہیں ہے چچی کے کمرے کی طرف رخ کرنے کا۔ میں خود مہ جیس کو آواز دیتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”خیر، کھٹنے والی تو وہ بھی نہیں۔ خود ہی بنا لیتی ہوں چائے۔“

”کیا ہوا ہے؟ میں پرچھتا ہوں۔ ہوا کیا ہے؟ یہ حد بندیاں۔ یہ کمرہ بندیاں۔ یہ سب کیا ہے؟“ وہ سخت متوحش تھے۔

”تھیا معرکہ۔“ خواجہ صاحب! تبدیلیاں تو آپ پچھلے ایک ہفتے سے دیکھ ہی رہے ہوں گے۔ یہ کایا پلٹ ہے کایا پلٹ۔“

”تبدیلیاں؟“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ مہ لفافے گھٹنگو کے اگلے دن تبدیلی تو نظر آنا شروع ہو ہی گئی تھی لیکن انہوں نے نوٹس نہ لیا۔ ظاہر ہے اتنے سال یہ گھر ایک عورت کے ہاتھ میں تھا، سارا انتظام، سارا انتظام۔ کچھ دقت تو لگے گا باقی سب کو اپنے حصے کی ذمہ داری سنبھالنے میں۔

صبح کا آغاز ہی مہ لفافے کو متحرک کرتا۔ ناشتے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ سب کو فردا، فردا، ان کی پسند کا ناشتہ کرانا۔ بچوں کے اسکول کے لیے لٹچ یا کسز تیار کرنا، دوڑھ ابل کر رکھنا، ناشتے کے ڈھیروں برتن خود دھونا کہ برتن دھونے والی ماسی دن میں ایک بار آتی تھی یعنی صبح

سویرے، رات کے کھانے کے برتن ہوتے یا دوپہر کو استعمال ہونے والے بڑے برتن دیکھی، ڈونگے وغیرہ۔ وہ ناشتے سے پہلے آتی اور مہ لفافے بھی کی نفاست پسند طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ ناشتے کے برتنوں کا ڈھیر اگلے چوبیس گھنٹوں تک کھیاں بھٹکا رہے، وہ سہ پہر کو بچن میں آکر دوپہر کے برتنوں میں سے بھی گلاس پلٹیں وغیرہ دھو جاتیں۔

دوپہر کے کھانے کی ذمہ داری مہ بارہ بھابھی کی تھی۔ وہ بس ہانڈی میں چچہ ہلا کر ٹام کر لیتیں کیونکہ سبزی وغیرہ کاٹ کر حتی کہ دھو کر بھابھی تیار کر چھوڑتی تھیں کہ بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد مہ بارہ بھابھی اپنی نیند ضرور پوری کرتی تھیں۔ گیارہ بجے بستر چھوڑنے کے بعد چائے ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ ساڑھے بارہ بجے بچن کو مدنی بخشش تو ان کے پاس صرف آدھ گھنٹا ہوتا تھا کیونکہ الی اور ای دونوں ایک سوا ایک بجے کھانا کھا لیتے تھے۔ اگر بڑی بھابھی پہلے بچن کا چکر نہ لگا چکی ہو تیں تو انہیں پتا چلتا کہ آدھ گھنٹے میں اتنا ڈھیر کھانا کیسے تیار ہوتا ہے۔

سداڑ چشتی فرخ میں تیار پڑی ہوتی۔ پیاز کٹی ہوئی، لہسن چھلا ہوا اور ادھک پیسی ہوئی پیالیوں میں رکھی ہوتی۔ سبزی بھی بنانے کے بعد دھو کر الگ تسلیے میں بھگوئی ہوتی۔ اگر کوفتہ یا کباب بنے ہوں تو قیے میں پہلے سے مسالے مکس کر دیے جاتے کبھی کبھار تو گوشت مسالے سمیت گھر میں چڑھا دیا جاتا۔ آٹا گوندھا رکھا ہوتا۔ بوں بڑی آسانی کے ساتھ وہ آدھ گھنٹے میں اس معرکے کو سر لیتیں۔

سہ پہر کی چائے مہ جیس بھابھی کے ذمے تھی۔ وہ تقریباً اس ٹائم گھر آتیں، اس لیے خالی چائے ہی بنانے کا ٹائم مل پاتا، چائے کے ساتھ جو دو سرے لوازمات پیش ہوتے، وہ عموماً ”مہ لفافے بھی یا مہ نازکی کار گزار رہتی ہوتی۔ آج کل چونکہ مہ لفافے شوہر کے آنے کے بعد بچن کے پھیرے لگانا بند کر دیے تھے اس لیے دو ایک دن مہ ناز ہی مہ جیس کا ساتھ دیتی رہی لیکن اس کی طبیعت کی گرانی کے سبب پچھلے چند روز

”واقعی یہ تو کیا پلٹ ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ مجھے پوری بات بتاؤ؟ آخر بات اتنی آگے کیسے بڑھی۔ ان دونوں میں معمولی کسٹ پٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے آخر اور تلے کی ہیں اور پھر مزاج بھی الگ الگ لیکن اتنی رنجشیں۔“

”بات صرف ان دونوں تک ہی تو محدود نہیں رہی۔ مہ لقا بھی لیٹ میں آگئی۔ نہ چھوٹیوں نے آپس میں کوئی کسر پائی رکھی نہ ہی بڑی کے بڑے پن کا لحاظ کیا۔“ لگن کے کعبے میں انیسویں ہی انیسویں تھا۔

”دکھنا؟ مہ لقا بھی۔ ناقابلِ یقین۔ آخر تم پوری بات بتائیں کیوں نہیں۔“ وہ حقیقت باتنے کے لیے بیٹے جھین تھے۔

”کالم سر پہ بڑے کی۔۔۔ مہ پڑھتے تو قاصدوں سے رہی تھی۔ آپ نے مجھ سے کیا سن ہو گا۔ اس نے تو بچے بس پڑے اپنی کیے۔ قاصد پڑے تو پھر چھوٹی بہن نے قاصد اب مہ لقا اپنی مہ لقا سے دور مجبور تھی اس کا جو عمل ہے۔۔۔ مہ لقا تو مہ لقا کے باوجود اپنے منہ سے بچے۔۔۔ مہ لقا تو مہ لقا کے حسن و ذہن ہمارا ہی ہے۔ لیکن ایسے کس مہ لقا کے۔۔۔ مہ لقا کے بھی سہ اور مہ لقا تو آپ۔۔۔ مہ لقا کے۔۔۔ مہ لقا کے پھر بھی ایسی بات نہیں کہ اس نے بالکل ہی بات نہ رکھا ہو۔ آخر خدا کی طرح قاصد اور ایسے ہی اس کے ہاتھوں لی ہیں۔“

اب بھی روز صبح اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ وہ ان چاروں کے بیچ باکس بھی تیار کرتی تھی لیکن مہ پارہ تو وہ دن یاد آتے ہیں جب اس کی بیٹیوں کی چٹیا تک تائی گویند حتی تھی اور چھوٹی رائے کے ڈانپور زنگ وہی بدلتی تھی۔ بس جب تک وہ بے دام کی غلام بنی رہی، اچھی تھی۔ بڑا آگے پیچھے پھرتی تھی بڑی تپا بڑی تپا کہتے ہوئے اب جو بے چاری کی خود پہ بن گئی ہے، ہاتھ پاؤں مار کے اپنی زندگی سنوار رہی ہے تو بری لگنے لگی اور رہی مہ جیسے تو آپ جانتے ہیں وہ ہمیشہ سے اپنے کام سے کام رکھنے والی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں ایک بری عادت ہے کہ کسی کا اوجار نہیں رکھتی نہ ہی

لحاظ مروت سے اس میں۔ منہ پہ جواب دے مارتی ہے۔ بس اس کی زبان کھلی تو مہ پارہ نے بھی حد کر دی۔“

”تم اصل قصہ مت سناؤ۔ اپنے تجربے پر پیش کرتی رہنا۔“ اب تو خواجہ صاحب کا تجسس اور نظر دونوں ہی اکتا کو جا پہنچے۔

”اور اصل بات آج سے نہیں کل شروع ہوئی تھی۔ مہ جیسے روڑ کی طرح سرشام ہی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں باہر پیرس پہ کھلتی ہیں جہاں اس وقت مہ پارہ سے محلے کے بچے بڑھنے آتے ہیں۔ بس ہوا یہ کہ بچوں کے شور سے تنگ آکر اس نے باہر نکل کر اسے یہ کلاس اپنے کمرے میں لگانے کو کہہ دیا۔“

”کمرے میں اتنی جگہ کہاں ہے کہ میں ان سات بچوں کو وہاں ٹھکانوں۔“ اس کے اپنے چاروں بچوں نے طحانہ ٹیک نہا تھی اور بس محلے کے دو بچے۔۔۔ مہ لقا کے بچے لکناج میں چلے جائیں یا پھر برآمدے میں۔“

”لکناج میں تو اس وقت مہران اور جبران کا راج ہوتا تھا۔۔۔ مہ لقا کی بند کریں گے نہ ہی میوزک اور برآمدے میں اپنی ٹیکٹ ہوں گے۔“

”کیس جی لے چائیں انہیں مگر خدا را کم از کم میرے سر پہ تو سوار نہ کریں۔ سر میں اس قدر شدید درد ہو رہا ہے۔“ تنگ بارے کام سے کو اور دو گھڑی کا جھین بیٹہ نہیں ہوتا تھا۔“

”اوہ تو وہ تمہارے سر پہ کب بیٹھے ہیں؟ تم جاؤ اپنے کمرے میں اور جی بھر کے آرام کرو۔“

”کیسے آرام کروں۔ بین کھر کھا کر ذرا آنکھ لگی تھی کہ شور سے جاگ گئی۔“

”تو تم بھی تو بے وقت سوتی ہو۔ بچوں پہ بگڑنا ناحق ہے۔ اگر بھری دوپہر میں یا آدمی رات کو میں یہ کلاس لگاؤں تو تمہارا احتجاج کرنا جائز بھی ہے۔ ظاہر ہے یہ آرام کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت سوائے تمہارے اور کون سوتا ہے۔ سب اپنے کام تمہاری نیند پہ قربان

آسانی سے سمجھ جائے والی نہیں تھی۔

آسانی سے ہر جانے والی نہیں تھی۔

”یہ تم کیا پوری کی پوری فریج میں گھسی ہوئی ہو؟“
 ”اور کچھ تو بے نہیں۔ میں نے سوچا، میں ہی گھس
 جاؤں۔“ وہ جل کے بولی۔ ”نہ روٹی ہے نہ ہی آٹا نہ
 کوئی برٹہ سلاٹس۔“

”ہاں“ وہ آٹا تو آج میں گوندھنا ہی بھول گئی۔ کیا کروں۔ روٹین میں نہیں ہے نا۔ ہمیشہ آپا ہی گوندھ دیتی تھیں لیکن اب تو انہیں اوپر بھی مصروفیات ہوتی ہیں۔ بازار سے روٹی منگوائی تھی۔“ وہ سکون سے راتھ کے لیے فیڈرنا سنے لگی۔

”اور بریڈ؟“

”ای کے وائنٹ میں دو روٹھا بریڈ کے ساتھ کھانا کھایا اور رضی بھی تو توری نہیں کھاتا“ مجھے میں مرج زیادہ ہو گئی۔ میں نے ایسے انڈے کس کیے اور سینڈویچ بنا لیے۔ اس نے فخریہ اعلان کیا لیکن مہ جیس تو کلس کے رہ گئی۔

”ایک آدھ سلائس تو بچا دیتیں۔“ فخر میں کچھ نہ کچھ تو موجود ہونا چاہیے۔ خالی فریج بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ایک ایذا شک موجود نہیں۔ فردت کا ایک دانہ نہیں بچنے نہ ہوئے جن دو کے دو سب چپٹے لر گئے۔ اس نے زور سے فریج بند کیا۔ بوچی آہ ازیں سن کر مہ لقا بھی اس طرف آگئیں۔

”زبان سنہال کے بات نہ کرو بھئی۔“ کیسے منہ بچاؤ کے میرے بچوں کو جن کدہ بچھے کھانا کھا رہے تھے ہی نہیں۔ بس میرے بچے ہی سب کھانا کھا رہے تھے۔ تو سارا وہ چھوٹی کھونس بول رہے تھے۔ اس نے بارہ ہی کیوں نہ بچ کر رہے ہو، اور تانے تانے دھڑکتے ہیں سے جو بچ جاتے ہیں وہ بڑی آپ اپنے کدے سے لے جاتی ہیں چہرے پر تھوہنے سے لیسے۔ میں بیانیا خط سوار ہوا ہے چہرے کی سنو میں دو کمرے کا کدہ ہوتا۔ اب اس عمر میں چکی ہیں حسن میں کھانا پیدا ہے۔

سامنے مہ لقا کو دیکھ کر اس کی زبان ذرا لڑائی پھر ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کرتی فیڈر سنبھال پھو پھالی نکلنے لگی لیکن مہ لقا نے راستہ روک دیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس مسئلے۔ اتنی زور و شور سے بحث ہو رہی ہے اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے کس مسئلے میں کھینچا جا رہا ہے؟“

”آپا! میں تو صرف اپنے کھانے کے لیے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ آگئیں تو ان سے پوچھ بیٹھی بس اتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی گھسیٹ لیا۔“

”مہ پارہ! تم اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہو۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ مہ ناز تم سے کتنی چھوٹی ہے۔

تمہیں اس کا اس حالت میں خیال رکھنا چاہیے اور تم اس کا کھانا پینا گن رہی ہو۔ میں نے تمہارے آن دونوں کیسے کیسے لاؤ اٹھائے ہیں، لو لے بٹا پنا کے منہ میں ڈالے ہیں اور تم۔ اور تو اور میرے بارے میں اپنی بڑی بہن کے بارے میں ایسی بات تم نے کیسے کہہ دی۔ بچے میں اتنا تنفر انداز میں اتنی حقیر۔ میرے لیے۔“ وہ غم سے چور چور لہجے میں سوال کر رہی تھیں۔

”میرے ساتھ جو جیسا کرے گا میں ویسا ہی پیش توں گی۔ جب تک آپ نے لاؤ اٹھائے میں نے نہیں جی حضوری کی۔ جب تک مہ جیس سیدھی رہی میں بھی چپ تھی۔ لیکن وہ منہ بھر کے میرے بچوں کو جن کدہ دے ان کی خوراک کو لو کے تو کیا میں چپ رہوں؟ اپنے باپ کا کھاتے ہیں۔ کسی سے تو نہیں چیتے۔“

”بھونہ! اپنے باپ کا؟ اس غلط فہمی سے نکل آئے۔ سب جانتے ہیں وہ اپنے باپ کا کتنا کھاتے ہیں اور وہ سوائے کے باپ کا کتنا۔“ مہ جیس نے فوراً مناسب برابر کر دیا۔ ”جتنی نعمان بھیا کی آمدنی ہے اگر وہ بخش اپنے مل بولتے پہ اولاد دلاتے تو آپ کبھی باغیچے کے بیدار کرنے کی ہمت نہ کرتیں۔ لیکن جب بغیر کچھ لے ساری سہولتیں مل جائیں تو یونہی اولاد کے ڈھیر کاٹ جاتے ہیں۔“

”چپ رہو تم مہ جیس۔“ مہ لقا کو اس کی زبان سے خوف محسوس ہوا۔

”بولنے دیں آپ! اسے بولنے دیں۔ پتا تو چلے کہ آخر اس کے اندر کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ آپ کبھی دیکھ بیٹھے کیسے اس کا احساس محرومی باہر اٹل رہا ہے۔ خود کے تو اولاد نہیں ہے دو سروں کی بھی چھ رہتی ہے۔“

”آپا! اس نے دوسری بار مجھے یہ طعنہ دیا ہے۔ پوچھتے اس سے یہ میری سکی بہن ہے یا دشمن۔ اس کا دل نہیں کا پتا مجھے بے اولادی کا طعنہ دیتے ہوئے۔“

”اور تو خالہ ہے یا ذائقہ تیرا کچھ نہیں پھنسا بہن

آپ اپنے سے آگے کسی کو بڑھتا دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ خصوصاً مجھے۔ مجھ سے زیادہ اہمیت تو آپ اس چھوٹی کو دیتی ہیں۔ اسے بھی گڑ سکھا دیے ہیں لوگوں کو منہ می میں کرنے کے۔

مہ ناز جو مہ جیوں کو بدلتا دھوتا بیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر سہل چلی آئی تھی، نوراً لپٹ میں آئی۔ ہکا بکا وہ دونوں بڑی بہنوں کے چہرے دیکھنے لگی۔ ایک کا چہرہ صدمے سے زرد پڑ چکا تھا تو دوسری کانٹھے کی پیش سے بھیبھو کا ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا بڑی آیا۔ بھیا! کیا بات ہے؟“
”کچھ نہیں۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے واپس مڑنے لگیں۔ ”داغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔“

”ہاں ہاں جو کجی باتیں کرے اس کا داغ خراب اور جو گستاخا ہو کر بیٹھ جائے وہ اچھا۔ جیسے یہ اور اس کا میاں۔“ مہ ناز کے ساتھ ساتھ اب اس کے شوہر جواں کو بھی تھیسٹ لیا گیا۔

”کیا جبران نے کچھ کیا ہے؟“ وہ رک کر پوچھنے لگی۔
”کسی نے کچھ نہیں کیا نہیں نے کہاں اس کا داغ خراب ہو گیا ہے تم کچھ دیر اور یہاں رکو گی تو تمہارے بھی پرچھے اڑا دیے گی۔ چکو نکلو یہاں سے۔ پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

♥ ♥ ♥
”ناممکن۔۔۔ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ خواجہ ہاؤس میں اتنا سب ہو گیا۔ کیسے؟ اتنی لمبی زبانیں میری ہواؤں کی۔۔۔“

خواجہ صاحب بے یقینی کے سے عالم میں بیٹھے افسوس سے سر ہلاتے رہے۔ بیگم سے ساری بات من کر بھی وہ یہ حقیقت ہضم نہ کر پا رہے تھے۔ جب مہ پارہ کا دیا بے اولاد کی کاٹھن یاد آتا تو جیسے کلجہ مسلا جاتا۔

”ہائے کیسا برا لگا ہو گا مہ جیوں کو۔ بیچاری کسول پہ کیا نہ گزری ہو گی۔“

اور جب اس کی دی بددعا یاد آتی تو وہی مہ جیوں مظلوم سے ظالم بن جاتی۔

کی اولاد کو کوستے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ خالہ ماں جیسی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو اسے ماسی کہا جاتا ہے لیکن تم نے یہ غلط کر دکھایا۔ ہاں ظاہر ہے جواں ہی نہیں وہ ماں ہی کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارا دل مٹا سے خالی ہے۔ اس لیے خدا نے تمہاری اولاد بھی سولی بھی رکھی ہے۔“

”مہ پارہ! خدا کا واسطہ ہے، اپنی زبان کو لگا دو۔“ مہ لقا نے مہ جیوں کے چہرے کو پہلے سفید پھر سرخ پڑستے دیکھا تو اس کی منتیں لیں۔

”آج مت روتیں۔ آج اتنا اہمیت زعم ہے اسے اپنے ماں ہونے پر۔ میری بے اولادی اس کی نظر میں خدا کی طرف سے ہی گئی کہ کئی سزا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتی۔ کبھی نہیں اولاد بھی عذاب اور سزا کی طرح ہی پڑا ہوتی ہے۔“ پھٹکارتی ہوئی وہ تہ کی طرف لیکن سے نکل گئی اور مہ پارہ فیروز پھینک کر سینہ پیٹنے لگی۔
”ہائے ہائے لو کچھ ٹہلی بددعا۔“ کہتی ہے مجھے۔
”مجھے کیا اپنی ماں جانی کہ۔“

”تم نے کون سا جنوں بول چال کیا ہے۔۔۔“
”ہی سہی اس نے۔“ آخرت اور آخرت کی بات نہیں کر وہ اپنے ذہن اور زبان سے اٹھ کر کچھ نہیں ہے۔ اسے اس حد تک لانے والی کجی تمہاری ہو۔“

”آپ کیوں میرا ساتھ دیتے نہیں۔ آپ تو ہمیشہ سے میرا وجود کھٹکتا ہے۔ یہ سب مجھے ہمیشہ شروع ہی آپ کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ نہ آپ اچھے بھلا پہلے گھر کا نظام تبدیل کرتیں نہ ہی کلم کے بوجھ اور دباؤ سے میرا داغ خراب ہو۔“

”وہ بہت خوش۔۔۔“ عزمہ میں جن تھامیے بوتھ اور دباؤ اپنے شانوں پہ ہے۔ اور۔۔۔ میرا تو نہ داغ خراب ہوا نہ میں نے کوئی ذرا بپایا۔“

”آپ کو شوق جو تے لیزری کرنے کا۔ آپ تو خوش تمہیں پاس بن کر۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ جان کھپانے کے بعد بھی میں پاس تو نہیں بن جاؤں گی وہ تو آپ ہی رہیں گی۔ جب نمبروں پوزیشن پہ آپ نے ہی رہنا ہے تو مجھے محنت کرنے کا کیا فائدہ۔ میں تو باپ کے گھر بھی نمبر دو تھی اور یہاں بھی نمبر دو۔“

۲۱ "تنی پتھریل کیسے ہو سکتی ہے وہ کہ اپنی ہی بہن کو اولاد کی بددعا دے ڈالی۔"

اتنے میں مدناز جائے کی ٹرے لیے چلی آئی۔ ساتھ ہی عمران بھی اندر داخل ہوا۔ خواجہ صاحب سے کچھ پہلے وہ چھوٹی بھابھی سے ساری روئید اوجان چکا تھا۔
"وہ نہیں آئیں؟" خواجہ صاحب نے صرف نظر اٹھا کے دیکھا تھا لیکن شفیقہ خاتون نے سوال کر ڈالا۔
"آئیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

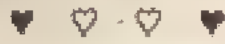
"بڑی آیا تو اس وقت سے روئے چلی جا رہی ہیں۔" وہ جیس کے پاس سمجھانے گئی تو لاشا سمجھ پہ بگڑ گئی کہ میں اسے غلط سمجھ رہی ہوں اور دوسروں کی حمایت کر رہی ہوں حالانکہ میرا تو یہی خیال ہے جتنی غلطی اس کی ہے اتنی ہی بچیا کی بھی لیکن غلطی تو ہر حال دونوں کی ہے۔ دونوں میں سے کوئی دوسرے کو اس بد مزگی کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ بھائیے تو خیر میری شکل تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ ان کے خیال میں تو میں بڑی آپا کی چنگی ہوں۔"

"نہ کھتا ہوں" کب تک کرے میں بند رہتی ہیں۔ کہہ دو سب سے رات میرے کمرے میں جا کر سوئیں اپنے اپنے شوہروں سمیت۔ سب کے دماغ درست ہونے والے ہیں۔ گھر کو محاذ جنگ سمجھ رکھا ہے۔ اپنے اپنے مورچے سنبھالے بیٹھی ہیں۔ آج رات میں یہ قصہ ختم کر کے رہوں گا۔"

غم کی وقتی کیفیت سے اٹکتے ہی خواجہ صاحب نے اپنی انہی دہشت پھیلاتے ہوئے ہنگامی میٹنگ کا اعلان کیا۔ ان کا خیال تھا ان کے ذرا گھر کئے کی دیر ہے سب سیدھے ہو جائیں گے۔ جیسے فرقان کے کمن بل درست کیے تھے ویسے ہی مد پارہ اور مد جہیں کی طبیعت بھی صاف ہو جائے گی۔ آئندہ ایسی محاذ آرائیاں کرنے کی جرات نہ کر پائیں گی۔ یہ چیلنج پورے اعتماد کے ساتھ ان کے چہرے پہ روشن تھا جسے پڑھ کر عمران نے چپکے سے دعا کی۔

"اگرچہ میں آپ کے اس اصول کے خلاف ہوں کہ ڈنڈے کے اندر پہ سب کو اپنی مرضی پہ چلایا جائے

پھر بھی اتنی! میری دعا ہے آپ کا یہ بھرم کبھی نہ ٹوٹے۔ اپنی اولاد پہ آپ کا یہ اعتماد بونستی قائم رہے۔"



"میں کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھوں گا نہ ہی وضاحت طلب کروں گا صبح والے واقعے کی۔ میں صرف وارننگ دے رہا ہوں کہ آئندہ اس چھت کے نیچے ایسا کوئی تماشا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔"

باری باری تمام بیٹوں اور بہنوں کے تھے ہوئے چہروں کی طرف کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے الی نے سخت ترین انداز میں وارننگ دی۔

"یہ کیا بات ہوئی الی! گھر میں اتنی بڑی بات ہو گئی اور آپ بجائے قصور وار کو تنبیہ کرنے کے سب کو ایک ہی لاشی سے ہانک رہے ہیں۔ وضاحت کیوں نہیں طلب کریں گے آپ۔ آپ کو ضرور وضاحت طلب کرنی چاہیے سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانا چاہیے۔ پتا چلنا چاہیے کہ تماشا کس نے شروع کیا اور کیوں کیا؟" عمران بھیا کو الی کی ڈانٹ ڈیٹ ذرا پسند نہ آئی۔ وہ تو اپنے طور پہ بیوی کی وکالت کرنے آئے تھے اور انہوں نے مقدمہ کی سماعت کے بغیر ہی فیصلہ سنا دیا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ الی! اچھا ہوا یہ مطالبہ خود انہوں نے کیا۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ قصور وار کو سزا ملے بجائے اس کے کہ سب ہی کو ایک لائن میں کھڑا کر کے لعنت ملامت کی جائے۔" لقمان بھیا بھی پورے پورے بیوی کے سکھائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"میں سب سن چکا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں۔ کون کتنا قصور وار ہے۔ تم سب کو ایک ہی لائن سے ہانکنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی کسی سے کم نہیں۔ لاتوں کے بھوت ہو تم سب۔ جب تک میرے ہاتھ تمہاری گردنوں تک تھے سب تیر کی طرح سیدھے تھے اب تمہارے اپنے بچوں نے قد نکالنے شروع کیے تو میں نے ڈھیل دے دی لیکن میری نرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم نے گھر کو میدان جنگ بنا ڈالا۔"

”لا حول ولا قوت الا تو ایسے بات کر رہے ہیں جیسے ہم لوگ میٹرک میں براؤز لٹ لانے کے بعد ان کے آگے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔“ عمران بھیا بڑبڑاتے۔

”اور کیا؟ بات عورتوں کے درمیان ہوئی ہے اور آپ ہمیں ڈرا دھمکا رہے ہیں۔ ہم نے بھلا کیا کیا ہے؟“ جبران کو بھی یہ ہیڈ ماسٹروں والی زبان پسند نہ آئی۔

”تم تو لوگوں نے یہ کیا ہے کہ اپنی عورتوں پر کنٹرول رکھنا چھوڑ دو۔ سب بات بھوک ٹھک پانی پی پی چاہتے ہیں۔ تم لوگوں کو تو اصل ایتنا چاہیے تھا۔ جلد میں تو جتنی آسائشیں دیوٹیوں کے یوں دے دو۔ لڑنے کی بات نہ کرو۔ تمنا چاہیے تھی۔ یہ میری باتیں تھیں۔ انہیں سناؤ۔ تم لوگوں کو تو یہ پتہ نہیں کہ عورتیں جتنی بھی غارت خانہ جھوٹی ہیں۔ وہ سب اور تمہارے۔ تمہیں یہاں ہوا ہے تمہارے رشتے۔ انہیں یہ پتہ نہیں کہ یہ کیا ہے۔“

”ابو! عمران! حیدر! کمرے کے آگے آؤ۔ آپ کو سب کا مذاق سنا کر چاہیے۔ یہاں سب کا نفس افسانہ نہیں ہوتا۔“ انہوں نے کہا۔ ”یہاں سب کا نفس افسانہ نہیں ہوتا۔“

”ہمارے رشتے میں ہم سب کی بات نہ کرنا۔“ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”اپنی سال ہو گئے ہیں اس نئے رشتے میں بندھے ہوئے کیا آپ کو پہلے کوئی شکایت ہوئی۔ اگر تو آپ کو شکایت ہے تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ وہ تو چھوٹی بات ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے سے متعلق اکڑایا۔ پھر شاید آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ کون قصور وار ہے کون نہیں۔ کیونکہ کم از کم میں تو یہ الزام اپنے سر نہیں لے سکتی۔ اتنے سالوں تک میں نے کیا نہیں کیا اس کھر کی خوشی کے لیے اور آج۔۔۔ آج میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو۔۔۔“ ان کی آواز بھرا گئی تو مہ پارہ کو کہنے کا موقع ملا۔

”ہاں ہاں۔ آپ نے کیا نہیں کیا۔ لیکن اس گھر کی خوشی کے لیے نہیں محض اپنی خوشی کے لیے۔ اپنی

حاکمانہ فطرت کی تسکین کے لیے۔ جب تک آپ کا دل چاہا آپ نے سن مانی کی جب اوروں پر زور چلا چلا کر دل بھر گیا تو اپنے شوہر کی خبر لی۔ مجھے اس حال تک پہنچانے والی آپ ہی ہیں۔ آپ نے مجھے دبا دبا کر اتنا مشتعل کر دیا کہ اب مجھ میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں رہا۔“

”واہ یہ اچھا جواب پیش کیا آپ نے اپنی زیادتیوں کا۔ برداشت کا مادہ تو آپ میں پیدا کئی طور پر مفقود تھا۔“ مہ جیسے نے حملہ کیا۔

”کر جانتی ہو تو پھر بار بار آزمائی کیوں ہو۔“ تنک کر جواب دیا گیا۔

”دیکھ لیا ابی! آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے تماشا کس نے شروع کیا۔“ عمران نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے فیصلہ طلب کیا۔

”عمران! تم جانتے نہیں تمہاری بیوی نے اپنی بہن کو کتنی سخت بددعا دی ہے، تمہارے بھتیجیوں کے حوالے سے۔“ لقمان نے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

”اور آپ بھی شاید انجان ہیں کہ آپ کی بیگم نے اپنی پھولی بہن کو ”کو کھ جلی“ کہہ کر باجھ ہوئے کا طعنہ دیا۔“

”بس؟ ابی کھڑے ہو گئے۔“ میں نے جھگڑا ختم کرنے بلوایا ہے نہ کہ مزید برہانے کو۔ غضب خدا کا، تمہیں اب ماں اور باپ تک کا لحاظ نہیں رہا۔ ختم کرو اس بے ہوش قہقہے کو۔“

”ختم کرنے ہی تو آئے ہیں ابی۔“ عمران نے مضبوط کبجے میں کہا۔ اب تک چپ چاپ سب سنتے مہراں نے چونک کر بھائی کے چہرے پر کچھ کھو جا اور جو اسے ملا اس نے اسے اندر تک دھلا دیا۔ وہ دھل گیا تھا ابی کے اعتماد کو دھندلا تا دیکھ کر۔

”بچھلے دو سال سے میں مسلسل کوششیں کر رہا تھا کہ کسی طرح اپنا کلینک سیٹ کر لوں۔ دو دو جگہ چلنے کرنے کے بجائے صبح کو ہاسپٹل پر ریکش کرنا اور شام کو اپنے کلینک بہترین طریقہ تو یہ ہی تھا کہ رہائش گاہ

شدت آگئی۔

”ابھی بڑے موقع آئیں گے شوق سے روتی رہتا۔ ہاں ابھی بڑے صاحبزادے! آپ نے بھی کوئی محل دیکھ رکھا ہے یا میں آپ کی مدد کروں اور جبران تم بھی جلد ہی اپنا بندوبست کرلو شاید آج کل مکان کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں تب ہی ہر کوئی اپنا اپنا لینے بھاگ رہا ہے۔ جاؤ میاں! تم کیوں پیچھے رہو۔ اور مہران۔ تم۔ خیر تمہیں کیا کہوں۔ تمہیں تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تمہارے اپنے نظریات بھی تو یہی ہیں۔ تم تو کھلم کھلا میرے خواب کا مذاق اڑا چکے ہو۔ اس وقت مجھے غصہ آیا تھا۔ شدید غصہ۔ لیکن اب سوچتا ہوں۔ تم ٹھیک کہتے تھے۔ شاید میں ہی غلط تھا۔ شاید میری خواہش ہی ناجائز تھی۔“ ہمیشہ کرنے پرسنے والے خواجہ خلیق الرحمان کالجہ نہایت مدح م تھا اور الفاظ بکھرے ہوئے۔ مہران تڑپ اٹھا۔ فوراً ”ابنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

”میں نے بھی آپ کے خوابوں کا مذاق نہیں اڑایا لی۔ اس وقت اگر میں نے کچھ التماسیدھا کہا بھی تھا تو وقتی جھنجھلاہٹ کے زیر اثر۔ میں صرف آپ کی شدت پسندی کے خلاف تھا۔“

”میں اب بھی سمجھ نہیں پا رہا یہ سب ہوا کیسے؟ اگر واقعی میرا اقدام غلط تھا تو اس کے برے نتائج اتنی دیر سے کیوں ظاہر ہوئے۔ آخر اتنا عرصہ یہ گھر میری حسب خواہش ہی تو چلتا رہا ہے۔“

”وہ اس لیے کہ تب تک آپ کی خواہش ان کی خواہش سے ٹکراتی نہیں تھی۔ سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ جس کو ساتھ رہنا ہو وہ بغیر کسی غرض کے بغیر کسی مفاد کے بھی رہ لیتا ہے۔ اگر کسی کا ساتھ منظور ہو تو اس کی سوزیادتیاں بھی سہہ لی جاتی ہیں لیکن جن کے دلوں میں گنجائش نہ ہو انہیں ہزار کوششوں کے بعد بھی اکٹھا نہیں رکھا جاسکتا۔ عمران بھیا کی ترقی کی راہ میں یہ گھر اور اس کا فرسودہ ماحول رکاوٹ تھا یہ جھکڑ اس رکاوٹ کے دور کرنے کا جواز بنا

اور لقمان بھیا جو عزت اور خودداری کا رنگ لالچے گئے ہیں۔ درحقیقت پارٹو شپ سے الیکٹرو گیس کا کاروبار شروع کرنے والے ہیں۔ وہ اور ان کی بیگم شروع سے ہی مل بیٹھ کے رہنے کے حامی نہیں۔ وہ تو مالی حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے چپ چاپ اتنے سال گزار دیے۔ اب جو معاشی حالت سدھرنے کے امکان پیدا ہوئے تو جھٹ اپنا ٹھکانا الگ کرنے کی سوچی۔

”اپنا کاروبار شروع کرنے والا ہے؟ کمال ہے اتنی بڑی بات اور میں بے خبر رہا۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تم لوگ بھی اب اچانک کوئی دھچکا دینے کے بجائے ابھی فیصلہ کرلو، کتب اور کس دن رخصت ہوتا ہے۔“ انہوں نے دل پتھر کر لیا۔

”الی۔ آپ۔ آپ ہمیں نکال رہے ہیں گھر سے؟“ مہ ناز قریب چلی آئی۔ اس کی پلکوں پہ ستارے ٹپکے تھے۔ وہ اپنی سب سے قیمتی ہوس کے آئینہ دیکھ پائے منہ پھیر کے کہنے لگے۔

”میں کون ہوتا ہوں کسی کو نکالنے والا۔ وہ سب بھی تو خود اپنا فیصلہ سنا گئے۔ تمہیں تو میں اجازت دے رہا ہوں۔ ہاں اگر اس گھر میں رہنا زیادہ پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ میں ہی کہیں اپنا بندوبست کر لوں گا۔“

”الی۔ لی پلیز۔“ وہ سسکنے لگی۔ ”ہمیں خود سے الگ مت کیجیے۔ ان کی سرکشی کی سزا ہمیں مت دے۔ وہ جانا چاہتے تھے، چلے گئے، کم از کم میں اس گھر کو، آپ کو اور امی کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”اور میں بھی نہیں۔“ مہ لقا بھی اٹھ کے قریب چلی آئیں۔ ”اگر مہ ناز کو میری حاکیت پہ اعتراض نہ ہو تو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بڑی آپا۔ آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو عزت دی ہے۔ مان دیا ہے اور انشا اللہ رہتی رہوں گی۔“ دونوں بہنیں خواجہ صاحب کے گھٹنوں پہ ہاتھ دھرے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ فرقہ بھیا اور جبران

ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل کر مسکرائے۔

”یہ سب تمہاری جذباتیت ہے۔ خیر میں زبردستی کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ پہلے ہی مجھ پر زیادتیاں کرنے کا الزام ہے۔ تمہاری مرضی۔ دکھتا ہوں یہ بھائی چارہ اور کتنے دن قائم رہتا ہے۔ مجھے تو اب کسی سے کوئی امید نہیں۔“

”امید ہمیشہ زندہ رکھنی چاہیے الی۔“ مہران نے تسلی دینا چاہی۔

”تم تو خیر مجھ سے کلام ہی نہ کرو۔ یہ تو سبکی بسنیس تھیں۔ تمہاری بیوی جو کچھ کرنے والی ہے وہ میں ابھی سے دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ ڈولی سے نیچے اس گھر کی دھیزل پاؤں بھی دھڑکے گی اس لیے یہ لمبے چوڑے دعوے رہنے دو۔“ کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید دلا سے دینے سے باز کیا۔

”یہ دعوے نہیں الی میرا عزم ہے کہ آپ کے چہرے پر اعتماد کی وہی جگہ گاہٹ لڑکے رہوں گا۔“ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا۔ اگر وہ معطر کی فطرت سے اس طرح آگاہ نہ ہو چکا ہوتا تو یہ دعویٰ کرنے سے واقعی باز رہتا کیونکہ کسی کی جی مرضی اور فطرت کے بغیر اس کا تعاون حاصل کرنا اس کے نزدیک جبر تھا اور وہ جبر کے ذریعے بیوی سے قربانیاں مانگ کر پھر سے وہ کہانی دہرائی نہیں چاہتا تھا لیکن۔ معطر۔ اس کے اعتبار کے سہارے ہی تو اس نے اتنا بڑا ارادہ کیا تھا۔

اور یہ چھ مہینے بعد کی بات ہے۔
صرف چھ مہینے۔

کہنے کو صرف چھ مہینے ہیں لیکن کیا کچھ نہیں بدل چکا۔

خواجہ ہاؤس کے بہت سے پرانے کمین یہاں سے جا چکے ہیں۔ کچھ نئے کمینوں کا اضافہ بھی ہو چکا ہے۔ تین ماہ قبل معطر ہمایوں، معطر خواجہ بن کر اس کے آئلن میں اتری تو ڈیڑھ ماہ پہلے ٹویٹی مہ ناز کی گود میں آئی۔

عید الفطر کی یہ صبح ہنگامہ خیر تھی۔ ای جان الداری سے نئے پنڈ کو نکال رہی تھیں۔ بڑی بھابھی ڈرائنگ روم میں صحن دھلے ہوئے پردے ٹانگ رہی تھیں، یہاں کی تفصیلی صفائی وہ کل ہی کر چکی تھیں جس کا اندازہ چم چم کرنی چیزوں کو دیکھ کے ہی ہو رہا تھا۔ ند اور آمنہ اپنے اپنے ہاتھوں پہ لگی مہندی کے رنگ کا مقابلہ کر رہی تھیں جو کل رات ہی چھوٹی چچی نے بڑی محنت سے کھینچی مٹی ہتھیلیوں پہ لگائی تھی۔ انہیں مہ لقا بھابھی کی طرف سے بار بار جلد تیار ہونے کی ہدایت مل رہی تھی۔ مہ ناز بھابھی جو ہمیشہ ہی اس موقع پر سب سے متحرک ہوا کرتی تھیں اب دس دس کر رہی کرتے۔ بیلو اور چیس چیس کرتی ٹویٹی میں اب بھی ہوئی تھیں۔ تین سالہ بیلو ننھی بسن کو ماں پہ قبضہ جمائے دیکھ کر احتجاجاً ”بلک اٹھتا تھا۔ معطر کچن میں شیر خرما سے سجے پلو ریں پیالوں پہ بادام اور پست کی ہوائیاں چھڑک رہی تھی جب حقیقہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔

”بیٹی! تمہاری پہلی عید ہے۔ سسرال میں اور تم کچن کی ہو کر بیٹھ گئی ہو۔ چلو شاباش جلدی سے نہادھو کر تیار ہو جاؤ۔ تمہارے الی نماز پڑھ کے آنے والے ہی ہوں گے، اس طرح دیکھ کے خفا ہوں گے۔ چلو چھوڑو سارے کام۔ خیر سے تمہارے بھابھیاں ہیں تیاں۔“ وہ پہلے بھی ایک بار اسے تیار ہونے کا کہہ کر گئی تھیں۔ اب اسے وہیں براجمان دیکھا تو ذرا سختی سے ڈپٹ کر بولیں۔

”بس ای! یہ رہ گیا ہے۔ مہ ناز بھابھی نے ہی بنایا ہے شیر خرما، نیچے سو رہے تھے تو انہیں بھی موقع مل گیا، صبح سویرے ہی شروع ہو گئیں، اب دودھ پلانے لگیں تو میں نے سوچا، کم از کم ٹھنڈا کر کے پیالوں میں ہی نکال لوں، نماز پڑھ کے آنے والے ہوں گے سب۔“ اس نے حسب عادت دوٹو کے پلو سے ہاتھ صاف کیا۔

”اف تو یہ یہ بچیاں کبھی بس۔ کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ تیار ہو جاؤ تیار ہو جاؤ۔ کان یہ جوں ہی نہیں رینگتی۔ اب زبردستی ہاتھ روم میں دھکیل کے آئی ہوں۔ سوچا ان کے نہانے تک کچن کی خبر لوں۔“ مہ

”خواجہ جی! ذرا رک جاتے۔ میرا مطلب ہے“
دوسری بھی آنے والی ہوں گی۔ ساری بسوں اور پوتے
پوتیوں کو اکٹھے ہی عیدی دے دیتے۔“ شفیقہ خاتون
نے اچکچاتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ جوایا“ خوشگین
نگاہوں سے گھورتے ہوئے وہ کچھ کہنے ہی والے تھے
کہ شاید موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے خاموش
رہ گئے۔

”واہ بڑی لمبی عمر ہے بھئی، بھیا آپ کی۔ ابھی یاد ہی
کر رہے تھے ہم لوگ۔“ جبران دروازے سے ہی
نعرے مارتا پوریج کی طرف لپکا۔ لقمان اور عمران کی
گاڑیاں آگے پیچھے ہی ان درواخل ہوئیں۔
”آمینہ! میں نے کہا تھا ناں کہ تم بھی میرے ساتھ
یہاں رک جاؤ۔ اتنا مزا آیا چاند رات کو۔ اپنی مندی
دیکھو ذرا کیسے تھوپی ہوئی ہے اور یہ دیکھو نئی چچی نے
کیسا پیارا ڈیزائن بنایا ہے۔“ آمینہ بہن کو چڑانے لگی۔
کچھ دن پہلے مہ لقا بھابھی امی جان کے ساتھ بچیوں کو

لقا بھابھی بھی اندر آگئیں۔ ”آپ بیٹھیں امی، ناشتہ
بناتی ہوں آپ کا“ باقی کام تو بچیوں کو تیار کرنے کے بعد
ہی ہو گا۔“

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں بھابھی! وہ دونوں
نہا لیں تو وہیں بیچج دیجیے گا میں تیار کروں گی۔ آپ
دوپہر کے کھانے کا کام نہیں، بھیا لوگ آگئے تو اچھا
نہیں لگے گا کہ گھر والے کچن میں تھے بیٹھے ہیں۔“
”ہاں ہاں۔ بس میں بلاؤ کے لیے گوشت کی بخنی
رکھنے ہی والی ہوں۔ کباب تو رات کو بنا لیے تھے۔
وقت کے وقت مل لوں گی“ زرا غفلت بھی مہ ناز نے تیار
کر دی تھی۔ ہاں وہ تم کیا بنا رہی تھیں رات کو مرغی کو
سرکہ وغیرہ لگا کے۔ اس کا کیا کرنا ہے۔“

”رات بھر کے لیے میری نیٹ ہونے رکھ دی
تھی۔ اب کوئی کام ہی نہیں۔ بس کھانے سے آدھ
گھنٹہ پہلے اون میں روٹ کر لوں گی۔“
”عید مبارک۔ عید مبارک۔“

باہر سے آتی آوازوں پر مچھر سر ہٹ بھاگ کر اپنے
کمرے میں گھس گئی۔ نہانے کے بعد گئیے پال بوتلی
کلب سے اکٹھے کر کے وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ عید کا
لباس سامنے ہی پینڈ پ پھیلا تھا وہ انھا کے ڈریسنگ روم
گھس گئی۔ جلدی جلدی لائٹ سا میک اپ کیا
مندى سے سجے ہاتھوں میں گہری سبز مقیش سے نئی
کانچ کی جوڑیاں پہنیں۔ دوسری کھانی میں پہلے ہی دو
منقش ننگن کسی حسین لٹے کی یادگار بنے کھنک رہے
تھے۔ مہران کی طرف سے منہ دکھائی میں ملنے والا یہ
تحفہ وہ کسی بھی وقت خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔
گرین جارحٹ کے سوٹ پہ پیچ ٹکر کے کنٹراسٹ کے
ساتھ فل امیر انڈری کا بڑا سا ڈوپٹہ لیے وہ لاؤنج میں
آئی۔ امی کو سلام کر کے ڈھیروں دعا میں اور پیار سمیٹا
فرقان بھیا اور جبران بھیا کو بھی عید کا سلام کیا۔ ادھر
ادھر نظریں دوڑا میں مہران کہیں نہیں تھا۔

”مہ لقا، آؤ بیٹی، مہ ناز کو بھی بلاؤ۔ اپنی اپنی عیدی
لے لو۔“ خواجہ صاحب نے سب بسوں کو پکارتے
ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کھانا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کیور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف = 250/ روپے

ملنے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی

عید دینے لگیں تو وہ تالی کے ساتھ ہی یہاں رہنے چلی آئی۔

”جاؤ ناؤرا! چچا کو بلا کر لاؤ۔ سب اکٹھے ہی ناشتہ کریں گے۔ لو بھلا بناؤ ذرا پہلے فون کر کے بتا دیجئے تم لوگ بغیر ناشتے کے نکل رہے ہو میں اہتمام ہی کر چھوڑتی۔“

حقیقہ خاتون کے ہاتھ میں بھول گئے۔ انہوں نے تو دہر کے کھانے کا کہا تھا مہ لقا کو۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ امی۔ ہم کوئی مسلمان ہیں؟“ مہ یاد کی شہد میں ڈوبی آواز پر خواجہ صاحب نے چونک کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کہتی رہی۔

”بچے رات سے ہی اتنے ایکساٹنڈ تھے صبح ہوتے ہی جانے کا شور مچا دیا اس لیے ناشتہ رہے دیا۔“

”اور ہمارا تو دل ہی نہیں چاہا عید والے دن بھی اکیلے بیٹھ کے کچھ کھانے کو“ اس لیے عمران نماز پڑھ کے آئے تو میں نے ساتھ ہی نکلنے کا کہہ دیا۔ آپ کیوں بڑی آبا کی پریڈ کر رہی ہیں۔ مل جل کے کچھ بلکا پھلکا ناشتہ تیار کر لیتے ہیں۔“ مہ جیوں بھا بھی لے مہ لقا کے پیچھے چک جاتے ہوئے کہا۔

”جاؤ ناؤرا! کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو“ کہا ہے ناں چچا کو بلا کر لاؤ۔ بھالی سے کہو حلوہ پوریاں اور نہاری لے کر آئے میرے بچے آئے ہیں۔“ خواجہ خلیق الرحمان کی خوشی سے سرشار آواز نے عمران کے کمرے تک سفر کیا۔ وہ طمانیت سے مسکرا دیا۔

”میں جاتی ہوں امی۔“ معطر ویسے ہی جانے کو بے چین تھی۔ موقع ملتے ہی کمرے میں چلی آئی۔

”یہ آپ اندھیرا کیے کیوں بیٹھے ہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر دہر پردے ہٹانے چاہے تاکہ روشنی ہو لیکن عقب سے اس نے جھٹکے کے ساتھ اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

”بتیاں بھالی رکھ دی۔ میں بتیاں بھالی رکھ دی۔“

وہ شرارت سے ہولے ہولے گنگنا یا اور وہ جھینپ

گئی۔

”آپ یہ بات سمجھی نہیں بھولیں گے۔ ہے ناں۔“

”اج میری اک من لے تو۔“

”اج میری اک من لے تو۔“

اس کی آواز میں شرارت اور زیادہ رہنے لگی تو معطر نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

”اچھا طریقہ ہے عید مبارک کہنے کا۔“

”ارے نہیں سامنے پا کے تو میں سارے طریقے سیکھے بھول جاتا ہوں میرے میاں مٹھو۔ میں تو آج تک ڈھنگ سے تمہارا شکریہ تک ادا نہیں کر پایا۔“

تم نے مجھے امی کے سامنے سراٹھا کر جسنے کے قابل کر دیا۔ میں سوچتا تھا کتنا مشکل ہے ان کا کھویا ہوا اعتبار لوٹانا۔ لیکن تم نے کتنی آسانی سے یہ مرحلہ سر کر لیا اور امی بھی جان گئے، جنہیں ساتھ رہنا ہو، ان کے لیے بازو وار کھو اور جو جانا چاہے ان کے لیے دروازہ کھول دو۔ زبردستی کا ساتھ صرف بیزاری اور نفرت کو جنم دیتا ہے۔ دیکھ لو وہی بھابھیاں جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پاتی تھیں آج ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے

اکٹھی آئی ہیں۔ یہ تو دلوں کے سودے ہیں۔ اس میں زبردستی کیسی۔ ہو سکتا ہے امی کی طرح انہوں نے بھی کوئی خواب دیکھ رکھا ہو اپنے گھر کے لیے۔ امی یہ بات سمجھ گئے ہیں بلکہ وقت انہیں سمجھا گیا ہے اسی لیے انہوں نے کھلے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اچانک کچھ اور کھو دینے کا خوف ان کی آنکھوں سے دور جا چکا ہے۔ انہوں نے برسوں پرانے خواب کو ہٹکنا چھوڑ دیا ہے۔“

”اؤ انہوں۔ چھوڑ نہیں دیا۔ طمانیں اب ہمارے ہاتھوں میں تھادی ہیں۔“ معطر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

www.Pansociety.com